376 مارچ 2017

ملّتِ اِسلامیہ کا عِلمی اور اصلاحی مجلّہ

مُدیرِ اعلیٰ
حافظ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مدنی

مُدیر
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

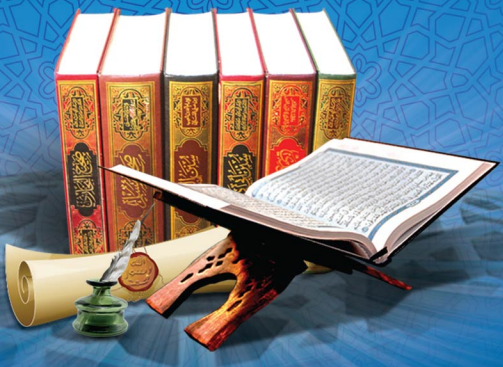

4 قانون توہین رسالت: دو انتہاؤں کے مابین
43 فروغ اسلام کے لیے لوگوں سے درکار تعاون
56 فکری محاذ پر اصطلاحات کی جنگ
60 تفسیر 'تدبر قرآن' کے بارے میں حسن ظن اور مولانا اصلاحی ....

جامعہ لاہور الاسلامیہ
مجلس التحقیق الاسلامی

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ محدث

لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی

مدیر
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

جلد 49 | مارچ 2017ء / رجب المرجب 1438ھ | عدد 02

مجلس مشاورت
■ حافظ صلاح الدین یوسف ■ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی ■ ڈاکٹر محمد اسحاق زاہد
■ ڈاکٹر حافظ انس مدنی ■ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی ■ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

فہرست مضامین

فکر و نظر — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی
قانونِ توہین رسالت؛ دو انتہاؤں کے مابین (4)

قانون و قضا — مفتی محمد خاں قادری
'قانون توہین رسالت کے غلط استعمال پر نظر ثانی' کا مسئلہ (39)

سیرت طیبہ — محمد نعمان فاروقی
فروغ اسلام کے لیے لوگوں سے درکار تعاون (43)

افکار و نظریات — طاہر الاسلام عسکری
فکری محاذ پر اصطلاحات کی جنگ (56)

تحقیق و تنقید — حافظ صلاح الدین یوسفؒ
تفسیر 'تدبر قرآن' کے بارے میں حسن ظن اور مولانا اصلاحی کے تضادات (60)

نائب مدیر
محمد نعمان فاروقی

ترسیل
محمد اصغر 0305 4600861

زرسالانہ =/300 روپے
فی شمارہ =/60 روپے

بیرون ملک
زرسالانہ =/20 ڈالر
فی شمارہ =/4 ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ
99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
042-35866396, 35866476
Email:
Mohaddislhr@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکر و نظر

قانونِ توہین رسالت
دو انتہاؤں کے مابین!

'اہانتِ رسول کا مسئلہ' ان دنوں پھر میڈیا میں زوروں پر ہے، ایک طرف قانون توہین رسالت کو رگید اجا رہا ہے تو دوسری طرف اُس کے غلط استعمال کی دہائی دی جا رہی ہے۔ کچھ لوگ اس قانون کے نمائشی ہونے کا شکوہ کر رہے ہیں کہ سیکڑوں مقدمات کے باوجود اس کی بنا پر آج تک کسی کو سزا نہیں ہو سکی اور ان کا موقف ہے کہ معاشرے میں پھیلی انارکی کی وجہ دراصل عدالتی عمل کا تعطل یا اس پر بے اعتمادی ہے۔ عالمی سطح پر مشعال خاں اور توہین مذہب کے دیگر واقعات کے بعد بھی یہ مسئلہ ایک بار پھر بڑی سرخیوں میں ہے۔ ذیل میں پانچ مستقل عنوانات کے تحت پانچ حصوں میں ان تمام مسائل کا نکات وار اجمالی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

① اہانتِ رسول کی شرعی و قانونی سزا ص ۴
② توہین رسالت کے جرم کا تحلیلی تجزیہ ص ۱۲
③ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے مجوزہ احتیاطیں ص ۱۵
④ قانون کو ہاتھ میں لینے کی شرعی سزا ص ۲۹
⑤ مسئلہ کا حل: دو انتہاؤں کے مابین عدل و انصاف کا قیام ص ۳۱

۱۔ اہانتِ رسول کی شرعی و قانونی سزا

اسلام میں اہانتِ رسول کی سزا قتل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ذات دین میں سب سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، آپ کی نبوت و رسالت پر ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت، قرآنِ کریم، جنت و جہنم، اور زندگی بھر کے سارے بنیادی اور شرعی احکام موقوف ہیں۔ اسلام کا مقصود تو ربِّ کریم کی عبادت و طاعت ہے، لیکن اس کا راستہ نبی کریم ﷺ کی رسالت اور اتباع کے بغیر مل نہیں سکتا۔ چنانچہ اسلام نے حب و طاعتِ رسول کو قانونی تقاضا بنانے کے ساتھ اسے خوبصورت جذباتی تعلق سے استوار کر دیا اور نبی کریم ﷺ کی محبت کو تکمیل ایمان کی شرطِ اوّل قرار دے دیا۔ نبی کریم ﷺ کی توہین کرنے کی سزا شرعِ اسلام میں قتل ہے۔

① جیسا کہ اس حدیثِ مبارکہ سے علم ہوتا ہے جسے سیدنا ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

كُنْتُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَتَغَيَّظَ عَلَى رَجُلٍ، فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ، فَقُلْتُ: تَأْذَنُ لِي يَا خَلِيفَةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَضْرِبُ عُنُقَهُ! قَالَ: فَأَذْهَبَتْ كَلِمَتِي غَضَبَهُ، فَقَامَ، فَدَخَلَ، فَأَرْسَلَ إِلَيَّ، فَقَالَ: مَا الَّذِي قُلْتَ آنِفًا؟ قُلْتُ: ائْذَنْ لِي أَضْرِبُ عُنُقَهُ، قَالَ: أَكُنْتَ فَاعِلًا لَوْ أَمَرْتُكَ؟ قُلْتُ :نَعَمْ، قَالَ: لَا وَاللهِ مَا كَانَتْ لِبَشَرٍ بَعْدَ مُحَمَّدٍ ﷺ[1]

"میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تھا کہ وہ کسی آدمی پر ناراض ہوئے اور بہت زیادہ ناراض ہوئے۔ میں نے کہا: اے خلیفہ رسول! اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار ڈالوں؟ تو میری اس بات نے اُن کا سب غصّہ زائل کر دیا۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر گھر چلے گئے اور مجھے بلوا بھیجا اور کہا: تم نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے کہا تھا: مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ فرمایا: اگر میں تجھے ایسے کہہ دیتا تو کیا واقعی تم یہ کر گزرتے؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا نہیں، اللہ کی قسم! سیدنا محمد ﷺ کے بعد کسی بشر کو یہ مقام حاصل نہیں۔"

② صحیح بخاری میں کعب بن اشرف یہودی اور ابو رافع یہودی کے واقعات ہیں۔ کعب بن اشرف کو قتل کرنے کی وجہ نبی کریم ﷺ نے یوں بیان فرمائی:

«من لكعب بن الأشرف؟ فإنه قدآذى الله ورسوله»[2]

"کعب بن اشرف کو کون قتل کرے گا؟ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت سے دوچار کیا ہے۔"

③ ان احادیث سے علم ہوا کہ توہین رسالت کی سزا قتل ہی ہے، اور اس کے لئے جرم اہانت کی تکرار یا اصرار ضروری نہیں۔ توہین رسالت کی سزا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فهٰذا قضاؤه ﷺ وقضاء خلفائه من بعده ولا مخالف لهم من الصحابة وقد أعاذهم الله من مخالفة هذا الحكم. وفي ذلك بضعة عشر حديثًا ما بين صحاح وحسان ومشاهير وهو إجماع الصحابة والآثار عن الصحابة بذٰلك كثيرة وحكى غير واحد من الأئمة: الإجماع على قتله.

قال شيخنا: وهو محمول علىٰ إجماع الصدر الأوّل من الصحابة والتابعين والمقصود:

---

۱ سنن أبي داؤد :كِتَابُ الْحُدُودِ، بَابُ الْحُكْمِ فِيمَنْ سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ، رقم ۴۳۶۳، سنن نسائی: كتاب تحريم الدم، باب حكم في من سبّ النبي ﷺ

۲ صحيح البخاري ۴۰۳۷، ۱۳۰۳، ۲۵۱۰، صحيح مسلم: ۱۸۰۱، سنن أبي داود: ۲۷۶۸، السنن الكبرٰى للبيهقي: ۷/ ۴۰ و ۹/ ۸۱

إنما هو ذكر حكم النبي ﷺ وقضائه فيمن سبّه.[1]

"نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا یہی فیصلہ ہے جس کا صحابہ کرام میں سے کوئی بھی مخالف نہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس حکم کی مخالفت سے بچائے رکھا۔ اس ضمن میں دس سے اوپر احادیثِ مبارکہ وارد ہوئی ہیں جن میں صحیح، حسن اور مشہور احادیث شامل ہیں اور اس مسئلہ پر اجماعِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہے۔ اس باب میں صحابہ کرام سے مروی آثار تو بہت زیادہ ہیں اور ایک سے زائد ائمہ اسلاف سے شاتم کے سزائے قتل پر اجماع کی صراحت بھی منقول ہے۔ ہمارے اُستاد شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سب اُمور صدرِ اوّل میں صحابہ کرام اور تابعین کے اجماع پر دلالت کرتے ہیں۔ ہمارا یہاں آپ کو سبّ وشتم کرنے والے بدبخت کے لئے آپ ﷺ کا حکم اور فیصلہ کو بیان کرنا ہی مقصود ہے۔"

④ اس موضوع پر بہت سی آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ کی وجہ سے علامہ ابن المنذر (متوفی ۳۱۹ھ) نے تیسری صدی ہجری میں اس کے حدّ ہونے پر اُمتِ اسلامیہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ

أجمع عوام أهل العلم علىٰ أن حدّ من سبّ النبي ﷺ القتل. وممن قاله مالك والليث وأحمد وإسحٰق وهو مذهب الشافعي[2]

"اہل علم کا اجماع ہے کہ جو آدمی نبی ﷺ کو گالی دیتا ہے، اس کی حد قتل کرنا ہے۔ اور اسی بات کو امام مالک، امام لیث، امام احمد، امام اسحٰق نے بھی اختیار فرمایا ہے اور امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔"

⑤ صحیح بخاری کی شرح فتح الباري میں حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے یوں لکھا ہے:

ونقل أبو بكر الفارسي أحد أئمة الشافعية في كتاب الإجماع: أن من سبّ النبي ﷺ مما هو قذف صريح كفر باتفاق العلماء، فلو تاب لم يَسقط عنه القتل؛ لأن حدَّ قذفه القتل، وحد القذف لايسقط بالتوبة[3]

"ائمہ شافعیہ میں سے امام ابو بکر نے کتاب الاجماع میں نقل کیا ہے کہ جس نے نبی ﷺ کو گالی دی جس سے صریح تہمت ظاہر ہوتی تھی تو ایسا شخص اجماعِ علما کی رو سے کافر قرار پائے گا۔ اگر توبہ بھی کرلے تو اس سے قتل ساقط نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کی اس تہمت کی حد قتل ہے۔ اور تہمت یعنی قذف کی حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔"

---

۱ زاد المعاد از علامہ ابن قیم جوزیہ: ۵/۵۹

۲ الصارم المسلول: ص ۳، طبع نشر السنہ، ملتان؛ الاشراف علیٰ مذاہب اہل العلم از ابن المنذر: ۳/۱۶۰، طبع دار الفکر

۳ فتح الباری: ۱۲/۲۸۱

⑥ بعض اہل علم کی رائے میں اس جرم کی سزا بطور حد 'قتل' نہیں، بلکہ ایسا کرنے والا دراصل مرتد ہو جاتا ہے، اس ارتداد کی بنا پر اس کو سزائے موت دی جائے گی، چنانچہ امام ابوسلیمان خطابی (متوفی:۳۸۸ھ) لکھتے ہیں:

إنّ السب منه الرسول الله ﷺ ارتداد عن الدين ولا أعلم أحدًا من المسلمين اختلف في وجوب قتله[1]

''اس (ام ولد) کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو دشنام طرازی دین سے ارتداد تھا۔ اور میں مسلمانوں میں سے کسی کو نہیں جانتا جس نے اس کے واجب القتل ہونے پر اختلاف کیا ہو۔''

⑦ امام ابن حزم اندلسی (م۴۵۶ھ) لکھتے ہیں:

ومن أوجب شيئًا من النكال على رسول الله ﷺ أو وصفه، وقطع عليه بالفسق، أو بجرحه في شهادته فهو كافر مشرك مرتد كاليهود والنصارى حلال الدم والمال، بلا خلاف من أحد من المسلمين[2]

''جس بدبخت نے نبی کریم ﷺ کی رسوائی کا ارتکاب کیا یا آپ کو اس سے منسوب کیا اور آپ پر فسق کا الزام لگایا یا آپ کی شہادتِ رسالت میں زیادتی کی تو یہود و نصاریٰ کی طرح وہ کافر و مشرک مرتد ہے، اس کا خون و مال حلال ہے۔ اس بارے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

⑧ ''احناف بھی یہی موقف رکھتے ہیں کہ اسے حداً قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، البتہ وہ مسلمان گستاخ کی صورت میں اس پر حدِ ارتداد و کفر کا حکم بھی لگاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا موقف دیگر مذاہب کے مقابلے میں اور بھی سخت ہو جاتا ہے... احناف اس پر حدِ ارتداد کا حکم بھی لگاتے ہیں لیکن وہ گستاخی کی وجہ سے اسے 'رِدۃ عامہ' نہیں بلکہ 'ردۃ خاصہ' قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک 'ردۃ خاصہ' کے مرتکب کا حکم زندیق کی طرح ہے کہ اسے لازماً قتل کیا جائے گا اور اُس کی توبہ کو قبول نہیں کیا جائے گا۔''

جیسا کہ فقہ حنفی کے نامور امام ابوالعباس احمد ناطفی (م۴۴۶ھ) لکھتے ہیں:

أمّا اذا سبَّ رسول الله ﷺ أو واحدًا من الأنبياء عليهم السلام يقتل حدًّا ولا توبة له أصلا سواءً بعد القدرة والشهادة أو جاء تائباً من قبل نفسه كالزنديق لأنه حدّ واجب فلا يسقط بالتوبة كسائر حقوق الآدميين وكحدّ القذف وبخلاف

---

۱ معالم السنن شرح سنن أبو داود از امام خطابی: ۳/۲۹۶

۲ المحلی از حافظ ابن حزم: ۲/۳۳۰

الارتداد لأنه يتفرد به المرتد لا حَقّ فيه لغيره من الآدميين[1]

"جب کسی نے رسول اللہ ﷺ یا کسی بھی نبی کو گالی دی تو اُس کو حداً قتل کیا جائے گا خواہ حراست میں لیے جانے یا گواہی کے بعد وہ گستاخ توبہ کرے یا خود بخود توبہ کے لئے پیش ہو جائے، اسے زندیق کی طرح ہر حال میں قتل کر دیا جائے گا کیونکہ یہ قتل اس گستاخ کی حد ہے پس توبہ سے ساقط نہیں ہو گی جیسا کہ آدمیوں کے باقی حقوق جس پر حق ہو، اس کی توبہ سے ساقط نہیں ہوتے اور جیسا کہ حد قذف ہے۔ گستاخ کا مسئلہ عام مرتد جیسا نہیں ہے کیونکہ عام مرتد کا فعل اس کا انفرادی فعل ہے جس سے کسی آدمی کا کوئی حق متاثر نہیں ہوتا۔"

⑨ توہین رسالت کی تعریف ان الفاظ میں علامہ ابن تیمیہ نے بیان کی ہے:

الكلام الذي يُقصد به الانتقاص والاستخفاف وهو ما يفهم منه السبّ في عقول الناس على اختلاف اعتقاداتهم كاللعن والتقبيح ونحوه[2]... تشریح یوں کی:

والكلمة الواحدة تكون في حال سبّا وفي حال ليست بسبّ فعُلم أن هذا يختلف باختلاف الأقوال والأحوال وإذا لم يكن للسب حد معروف في اللغة ولا في الشرع فالمرجع فيه إلى عرف الناس فما كان في العرف سبا للنبي فهو الذي يجب أن ننزل عليه كلام الصحابة والعلماء وما لا فلا.

"ایسا کلام جس سے نیچا کرنا اور ہلکا دکھانا مقصود ہو اور لوگوں کی عقلیں اپنے عقائد کے اختلاف کے باوجود اس کو گالی سمجھیں جیسا کہ لعن وطعن یا برا بھلا کہنا وغیرہ۔" ایک اور مقام پر وضاحت کرتے ہیں:

"ایک ہی کلمہ کبھی گستاخی ہوتا ہے اور کبھی نہیں، تو پتہ چلا کہ اقوال واحوال کی بنا پر اس کا حکم مختلف ہو گا، چنانچہ جب لغت وشرع میں گستاخی کی کوئی متعین تعریف نہیں تو اس میں لوگوں کے عرف ر رواج کو دیکھا جائے گا۔ سو جو عرف میں نبی کریم ﷺ کے لئے گالی سمجھا گیا، تو اسی پر صحابہ کرام اور علما کا کلام محمول ہو گا۔"

قاضی عیاض (متوفی: ۵۴۴ھ) نے بھی الشفاء بتعريف حقوق المصطفٰی میں 'گستاخی رسول' کی ایک تعریف[3] درج کی ہے، تاہم مذکورہ تعریف زیادہ بہتر ہے۔

---

۱ فتاویٰ حسب المفتین: ۲/ ۳۳۷ بحوالہ 'گستاخ رسول کی سزا اور احناف کا موقف' از علامہ خلیل الرحمٰن قادری: محدث، اگست ۲۰۱۱ء

۲ الصارم المسلول على شاتم الرسول از شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ: ص ۵۶۱... ص ۵۴۱

۳ الشفاء بتعريف حقوق المصطفٰی للقاضی عیاض: ۲/ ۹۳۲

الغرض اہانتِ رسول کی سزا کے قتل ہونے میں مسلمانوں کے مابین کوئی اختلاف تو نہیں، تاہم اس جرم کی توجیہ میں ایک سے زائد قول موجود ہیں۔

⑩ پاکستانی قانون میں اہانتِ رسول کی سزا: مذکورہ بالا موقف تو اس شریعتِ اسلامیہ کا ہے جس کو ہر مسلمان اپنے ایمانی تقاضے کے طور پر تسلیم کرتا اور واجب الاتباع مانتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ایک 'اسلامی جمہوریہ' ہونے کے ناطے توہین رسالت کا قانون بھی موجود ہے جو ارضِ پاکستان کے قانون Law of the Land ہونے کے ناطے اس ملک کے جملہ مسلم و غیر مسلم افراد پر بلا امتیاز نافذ ہے جس کا متن یہ ہے:

"دفعہ ۲۹۵(الف): کسی جماعت کے مذہب یا مذہبی اعتقادات کی تذلیل کے ذریعے اس کے مذہبی جذبات کی بے حرمتی کی نیت سے کینہ وارانہ اور ارادی افعال: جو کوئی شخص (پاکستان کے شہریوں کی) کسی جماعت کے مذہبی جذبات کی بے حرمتی کرنے کے ارادی اور کینہ وارانہ مقصد سے الفاظ کے ذریعہ خواہ زبانی ہوں یا تحریری یاد کھائی دینے والے خاکوں کے ذریعے مذکورہ جماعت کے مذہب یا مذہبی اعتقادات کی تذلیل کرے یا تذلیل کرنے کی کوشش کرے تو اسے کسی ایک قسم کی سزا اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو دو سال تک ہو سکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

دفعہ ۲۹۵ (ب): قرآن پاک کے نسخے کی قصداً بے حرمتی وغیرہ کرنا: جو کوئی قرآن پاک کے نسخے یا اس کے کسی اقتباس کی عمداً بے حرمتی کرے، اس کا نقصان یا بے ادبی کرے یا اسے توہین آمیز طریقے سے یا کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کرے تو وہ عمر قید کی سزا کا مستوجب ہو گا۔

دفعہ ۲۹۵ (ج): پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں توہین آمیز الفاظ وغیرہ استعمال کرنا: جو کوئی الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا نقوش کے ذریعے، یا کسی تہمت، کنایہ یا درپردہ تعریض کے ذریعے بلاواسطہ یا بالواسطہ رسول پاک حضرت محمد ﷺ کے پاک نام کی توہین کرے گا تو اسے موت یا عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کی سزا کا بھی مستوجب ہو گا۔"[1]

⑪ ۷ا مئی ۱۹۸۶ء کو سیکولر وکیل عاصمہ جہانگیر نے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں نازیبا الفاظ بولے جس کی روک تھام کے لئے قومی اسمبلی میں (موجودہ وفاقی وزیر احسن اقبال کی والدہ) محترمہ نثار فاطمہ نے توہین رسالت کے مجرم کے لئے سزاے موت کا بل پیش کیا جس کے نتیجے میں ۲۹۵سی کی صورت میں توہینِ رسالت کا قانون نافذ[2] کیا گیا لیکن اس قانون میں توہین رسالت کی سزا

---

۱ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ اور اس کی ذیلی دفعات کا متن

۲ فوجداری ترمیمی ایکٹ نمبر ۳... سال ۱۹۸۶ء

'سزائے موت یا عمر قید مع جرمانہ' کی صورت میں رکھی گئی تھی۔

⑫ ذوالفقار علی بھٹو کے زیر نگرانی تیار ہونے والے ۱۹۷۳ء کے متفقہ دستور میں آرٹیکل ۲۰۳ کے تحت وفاقی شرعی عدالت کسی قانون کے خلافِ اسلام ہونے کا جائزہ لے سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہدِ ناموس رسالت محمد اسمٰعیل قریشی ایڈووکیٹ نے ۱۹۸۴ء میں وفاقی شرعی عدالت میں ایک رِٹ پٹیشن دائر کی تھی جس میں مذہبی دل آزاری کے سابقہ قوانین کو ناکافی قرار دیتے ہوئے، ان میں توہین رسالت کے جرم کی سزا کے تعین کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۶ء کے بل سے یہ قانون عین اسلام کے مطابق نہ ہو سکا، اور جناب محمد اسمٰعیل قریشی کی رِٹ پٹیشن کی ضرورت باقی رہی، اس بنا پر وفاقی شرعی عدالت میں داخل اس رٹ پٹیشن کا فیصلہ اکتوبر ۱۹۹۰ کو آیا جس میں عدالت نے قرار دیا:

"مندرجہ بالا بحث کے پیش نظر ہماری رائے یہ ہے کہ عمر قید کی متبادل سزا، جیسا کہ دفعہ ۲۹۵ سی پاکستان ضابطۂ تعزیرات میں مقرر ہے، احکاماتِ اسلام سے متصادم ہے جو قرآن اور سنت میں دیئے گئے ہیں لہٰذا یہ الفاظ اس میں سے حذف کر دیئے جائیں۔ ایک شق کا مزید اضافہ اس میں کیا جائے، تاکہ وہی اعمال اور چیز جب دوسرے پیغمبروں کے متعلق کہی جائیں، وہ بھی اسی جرم کے مستوجبِ سزا بن جائے جو اوپر تجویز کی گئی ہے۔ اس حکم کی ایک نقل صدرِ پاکستان کو دستور کے آرٹیکل ۲۰۳(۳) کے تحت ارسال کی جائے، تاکہ قانون میں ترمیم کے اقدامات کئے جائیں اور اسے احکاماتِ اسلام کے مطابق بنایا جائے۔ اگر ۳۰ر اپریل ۱۹۹۱ء تک ایسا نہیں کیا جائے گا تو 'عمر قید' کے الفاظ دفعہ ۲۹۵ سی تعزیراتِ پاکستان میں اس تاریخ سے غیر مؤثر ہو جائیں گے۔"[۲]

گویا مذکورہ بالا فیصلہ کی رو سے ۲۹۵ سی کے قانون میں نہ صرف عمر قید کے الفاظ ختم ہو گئے بلکہ یہ قانون پیغمبر اسلام محمد ﷺ سے بڑھ کر تمام انبیاے کرام کی توہین تک وسیع کر دیا گیا۔ فاضل عدالت کا فیصلہ ہونے کے ناطے اس میں شرع و قانون اور عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا۔

⑬ وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کے بعد نواز حکومت کے پہلے دور ۱۹۹۲ء میں، پارلیمنٹ میں یہ معاملہ دوبارہ پیش ہوا۔ ۲ر جون ۱۹۹۲ء کو قومی اسمبلی میں زیر بحث آیا اور اسمبلی نے 'عمر قید' کی سزا کے خاتمے کو

---

۱ دیگر انبیاے کرام کی توہین کے بارے میں سیدنا عمر فاروق کا ارشاد ہے: من سبّ الله أو سبّ أحدًا من الأنبياء فاقتلوه (سنن ابو داود: ۴۳۶۲، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۷/ ۶۰)

۲ پی ایل ڈی، فیڈرل شریعت کورٹ: ۱۹۹۱ء.... جلد: ۴۳/ ص ۱۰

منظور کر دیا اور ۸ر جولائی ۱۹۹۲ء کو پاکستان کی سینیٹ نے بھی اس بل کو اتفاقِ رائے سے منظور کیا اور آج پاکستان میں یہی قانون نافذ ہے جو آخر کار پارلیمنٹ کی طرف سے منظور ہوا ہے۔[1]

الغرض پاکستان میں توہین رسالت کا قانون پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے باضابطہ منظوری کے بعد نافذ ہوا ہے اور اس کو ضیاء الحق کے قوانین کا نام دے کر رد کرنا غلط ہے۔ یہ ایک جمہوری قانون ہے جس کے نفاذ میں جمہوری تقاضے پورے کئے گئے ہیں اور پاکستانی عوام کی اکثریت اس قانون کو چاہتی ہے، اور اس کے خاتمے کی دہائی دینا شریعتِ مطہرہ سے مذاق اور پاکستانی عوام کی آرا کی توہین کے مترادف ہے۔

⑭ برصغیر پاک وہند میں متعدد مذاہب سے وابستہ لوگ ہمیشہ سے مل جل کر رہتے آئے ہیں اور مختلف اقوام کی مسلسل یورش کے نتیجے میں یہاں ان مذاہب کے مابین کشاکش کی صورتحال بھی رہتی ہے۔ ان سیاسی مصلحتوں کے تحت، ماضی میں بھی یہاں توہین مذہب کے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ جب برطانوی انڈیا میں اس جرم کی روک تھام کا کوئی قانون موجود نہیں تھا، تو بانیانِ پاکستان... جو قانونی ماہرین بھی تھے... علامہ محمد اقبال اور محمد علی جناح نے قانون کو ہاتھ میں لینے والوں کا مقدمہ لڑا، لاہور میں ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال نے غازی علم دین شہید کو سزائے موت دینے کے واقعے کی مذمت کرتے ہوئے بیماری کے باوجود مولانا ظفر علی خاں کی معیت میں، ان کی میت کو خود قبر میں اُتارا، ان کی چٹائی پر لیٹے اور اپنی ندامت کا یوں اظہار کیا: ''ترکھانوں کا بیٹا، پڑھے لکھوں پر بازی لے گیا۔'' اسی طرح کراچی میں غازی عبد القیوم نے عین کمرۂ عدالت میں شاتم رسول نتھورام کو ذبح کر دیا، اس کو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں نصیحت کی کہ ''کیا غازی عبد القیوم ڈگمگا گیا ہے، اُس کے قدم لڑکھڑا گئے ہیں؟ اسکو بتاؤ کہ میں جنت کو اس سے چند لمحوں کی مسافت پر دیکھ رہا ہوں۔'' پھر آپ نے ضربِ کلیم میں 'لاہور و کراچی' کے عنوان سے ایک رباعی لکھی:

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے، فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ!
قدر و قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر

اور قائد اعظم محمد علی جناح نے لاہور میں ایک ہی مقدمہ لڑا اور وہ غازی علم دین شہید کا مقدمہ تھا جس میں

---

[1] اس قانون پر ۱۹۹۲ء کے بعد مزید پیش قدمی کیا ہوئی، اس کا تذکرہ حالیہ شمارہ میں مضمون 'سینٹ کو بھیجی سفارشات' میں دیکھیں۔

سیشن کورٹ نے راجپال کو مجرم قرار دیا لیکن قانون نہ ہونے کی بنا پر ہائیکورٹ نے اسے بری کر دیا، سو علم دین نے قانون کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کو قتل کر دیا۔ اور واضح ہے کہ جناح وہی مقدمات لڑتے تھے جس میں وہ اپنے موکل کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ ان واقعات سے اتنا ہی علم ہوتا ہے کہ توہین رسالت کی شرعی سزا 'موت' ہی ہے۔ تاہم یہ واقعات اس دور کے ہیں، جب اس جرم کے انسداد کا کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ اس وقت قانون کو ہاتھ میں لیے بنا کوئی چارہ نہ تھا، جبکہ آج اس کا باضابطہ قانون موجود ہے، اور مسلمانوں کو اسی قانون کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور بہر صورت قانون شکنی سے گریز کرنا چاہیے۔

۲۔ توہین رسالت کی شرعی سزا کا تجزیہ

توہین رسالت ایک سنگین ترین جرم ہے جو اپنے مرتکب کو سزاے قتل کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس میں کئی حقوق متاثر ہوتے ہیں جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومما يوضح ذلك أن سبّ النبي ﷺ تعلّق به عدة حقوق: ❶ حق الله سبحانه من حيث كفر برسوله وعادى أفضل أوليائه وبارزه بالمحاربة ومن حيث طعن في كتابه ودينه فإن صحتهما موقوفة على صحة الرسالة. ومن حيث طعن في ألوهيته فإن الطعن في الرسول طعن في المرسل وتكذيبه تكذيب لله تبارك وتعالىٰ وإنكار لكلامه وأمره وخبره وكثير من صفاته.

❷ وتعلق به حق جميع المؤمنين من هذه الأمة ومن غيرها من الأمم فإن جميع المؤمنين مؤمنون به، خصوصًا أمته فإن قيام أمر دنياهم ودينهم وآخرتهم به بل عامة الخير الذي يصيبهم في الدنيا والآخرة بواسطته وسفارته، فالسبّ له أعظم عندهم من سبّ أنفسهم وآباءهم وأبناءهم وسبّ جميعهم كما أنه أحبّ إليهم من أنفسهم وأولادهم وآبائهم والناس أجمعين.

❸ وتعلّق به حق رسول الله ﷺ من حيث خصوص نفسه فإن الإنسان تؤذيه الوقيعة في عرضه أكثر مما يؤذيه أخذُ ماله وأكثر مما يؤذيه الضرب. بل ربما كانت عنده أعظم من الجرح ونحوه، خصوصًا من يجب عليه أن يظهر للناس كمال عرضه وعلوّ قدره لينتفعوا بذلك في الدنيا والآخرة. فإن هتك عرضه قد يكون أعظم عنده من قتله فإن قتله لا يقدح عند الناس في نبوته ورسالته وعلوّ قدره كما

أن موته لا يقدح في ذلك بخلاف الوقيعة في عرضه. فإنها قد تؤثر في نفوس بعض الناس من النفرة عنه وسوء الظن به، ما يفسد عليهم إيمانهم ويوجب لهم خسارة الدنيا والآخرة[1]

"معلوم ہوا کہ توہین رسالت سے بہت سارے حقوق متاثر ہو جاتے ہیں: (۱) اللہ سبحانہ کا حق، جب کوئی شخص اس کے رسول کا انکار کرتا، اور اس کے افضل محبوب سے دشمنی مول لیتا ہے تو وہ اسے جنگ کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ اللہ کی کتاب اور اس کے دین میں طعنہ زنی کا مرتکب ہوتا ہے، جن دونوں کی درستگی رسالت کی صحت پر ہی موقوف ہے۔ اور یہ اللہ کی بندگی میں بھی نشتر زنی ہے کیونکہ رسولِ کریم کی اہانت، بھیجنے والے اللہ رحیم کی توہین ہے۔ اور رسول کی تکذیب اللہ تبارک وتعالیٰ کی تکذیب اور اس کے کلام، اس کے حکم، اس کی خبر اور اس کی اکثر صفات کا انکار ہے۔

(۲) اور توہین رسالت سے اس اُمت اور تمام امتوں کا حق بھی متاثر ہوتا ہے کیونکہ تمام ایمان والے بالخصوص اُمّتِ محمدیہ آپ پر ایمان رکھتی ہے۔ ان کی دنیا ودین، آخرت بلکہ تمام بھلائیاں جو دنیا وآخرت میں ملنی ہیں، آپ کے واسطے اور سفارت کے سبب ہی سے ہیں۔ چنانچہ اس نبی کو گالی دینا، ان مؤمنوں کے نزدیک ان کی ذات، ان کے والدین، ان کے بیٹوں اور ان سب کو گالی دینے سے سنگین تر ہے کیونکہ وہ نبی اُن کے لئے ان کی جانوں، اولادوں، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔

(۳) اس اہانت سے رسول اللہ کا ذاتی حق بھی متاثر ہوتا ہے، کیونکہ انسان کو اپنی عزت میں دخل اندازی اپنے مال کی چوری سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اور اکثر اوقات مار سے بھی زیادہ تکلیف دیتی بلکہ زخم سے بھی سنگین تر ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ایسی شخصیت کے لئے جو لوگوں میں نمونہ بن کر آیا ہو، اور اپنی کامل عزت اور بلند منزلت کے سبب لوگوں کو دنیا وآخرت میں اپنے اُسوہ سے استفادہ کرنے کی دعوت دیتا ہو۔ ایسے شخص کی عزت میں دخل اندازی بعض اوقات اس کی شہادت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ شہید ہو جانا لوگوں کے ہاں اس کی نبوت ورسالت اور بلند مقام کے منافی نہیں ہوتا۔ برخلاف اس الزام تراشی اور طعنہ زنی کے، جو لوگوں کے دلوں میں نفرت اور بدظنی کے بیج بو دے، جس سے آخر کار اُن کا ایمان خراب ہو جائے اور دنیا وآخرت کا خسارہ لازمی ہو جائے۔"

المختصر اہانتِ رسول سے جہاں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حق انتخاب متاثر ہوتا ہے جو اُس نے نبی کریم ﷺ

---

۱ الصارم المسلول علی شاتم الرسول از شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ: مسئلہ ۲... ص ۲۹۳، ناشر: الحرس الوطنی السعودی

کو نہ صرف تمام انسانیت کا رسول بلکہ تمام انبیا کے لئے بھی واجب الاتباع بنا کر بھیجا ہے بلکہ رسول اللہ کی اہانت کرنے والا دراصل اس رسالت کی بھی توہین کرتا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کو مبعوث فرمایا۔ اسی طرح اس توہین میں نبی کریم ﷺ کا ذاتی حق بھی متاثر ہوتا ہے جو کسی بھی محترم و معتبر ہستی کا بنیادی اور مسلّمہ حق ہے کہ اس سے ان باتوں کو منسوب نہ کیا جائے جو خلافِ حقیقت ہوں اور جن سے اس کے احترام میں کمی واقع ہوتی ہو۔ پھر اہانت رسول سے اس اُمت کا حق بھی متاثر ہوتا ہے جو آپ سے دل و جان سے محبت کرتی اور آپ کی ہر ہر اَدا کو بطورِ اُسوۂ حسنہ اپنی زندگی میں جاری و ساری کرنے کو تیار رہتی ہے۔

☜ مزید برآں کسی شخصیت کی توہین کا مسئلہ اسلام میں ایک گناہ سے بڑھ کر ایک جرم[1] ہے کہ جس میں کسی ذات سے ایسی بات کو منسوب کیا جاتا ہے جو اس میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ یہ بہتان[2] ہونے کے ناطے ایک قابل سزا جرم بھی ہے۔ گویا اس میں اللہ کے حق کے ساتھ، متاثرہ ذات کی حق تلفی بھی پائی جاتی ہے۔ جس طرح چوری اور بدکاری محض توبہ اور مسروقہ شے واپس کرنے یا نکاح کر لینے سے معاف نہیں ہو جاتے، بلکہ اس میں سزا کے بغیر چارہ نہیں ہوتا، اسی طرح اہانت ایسی تہمت یا بہتان ہے جو کسی ذات کے شخصی حق میں مداخلت اور زیادتی کا ارتکاب ہے۔ اس کی معافی وہی ذات ہی دے سکتی ہے جس کے حق میں یہ زیادتی کی گئی۔ پھر تیسرے حق اُمت کے ناطے، پوری امتِ محمدیہ کے جو سینے چھلنی کئے جاتے ہیں، اس کی معافی بھی اجماعِ امت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک دور نبوی میں اس کی معافی کے امکانات کی بات ہے تو حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

وأما تركه ﷺ قد من قدح في عدله بقوله: "اعدل فإنك لم تعدل" وفي حكمه ﷺ بقول: "أن كان ابن عمتك." وفي قصده ﷺ بقوله: "إن هذه قسمة ما أريد بها وجه الله" أو في حكومته ﷺ بقوله: "يقولون إنك تنهى عن الغيّ وتستحل به فذلك أن الحق له فله أن يستوفيه وله أن يتركه وليس لأمته ترك استيفاء حقه ﷺ.

وأيضًا فإن كان هذا في أول الأمر حيث كان ﷺ مامورًا بالعفو والصفح وأيضًا فإنه كان يعفو عن حقه لمصلحة التاليف وجمع الكلمة ولئلا ينفِّر الناس عنه ولئلا

---

۱ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أن سب الرسول ﷺ جناية لها موقع يزيد على سائر الجنايات بحيث يستحق صاحبها من العقوبة ما لا يستحقه غيره (الصارم المسلول: ص۲۹۱)

"شتم رسول کے جرم کی سنگینی تمام جرائم سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کا مرتکب اتنی بڑی سزا کا مستحق ہے جو دیگر جرائم میں نہیں۔"

۲ جیسا کہ پیچھے نکتہ نمبر۵ میں امام ابو بکر کی زبانی اس کو فتح الباری میں ذکر کیا گیا ہے۔

يتحدثوا أنه يقتل أصحابه وكل هذا يختص بحياته ﷺ[1]

"جہاں تک آپ ﷺ کا اس بدبخت کو چھوڑ دینا ہے جس نے آپ ﷺ کے وصفِ عدل میں یہ کہہ کر الزام تراشی کی تھی کہ "آپ ﷺ انصاف فرمایئے، آپ نے انصاف نہیں کیا۔" اور جس نے آپ کے فیصلہ میں یہ کہہ کر بداعتمادی ظاہر کی تھی کہ "یہ اس لئے آپ ﷺ نے کیا ہے کہ وہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے[اس لئے آپ کا فیصلہ اس کے حق میں ہے]۔" اور جس نے آپ کے ارادہ میں یہ کہہ کر عیب جوئی کی تھی کہ "آپ ﷺ نے اس تقسیم کے ذریعے اللہ کی رضا پوری نہیں کی۔" اور جس نے آپ کی حکومت پر یوں طعنہ طرازی کی تھی کہ "آپ تو گمراہی سے روکتے ہیں لیکن خود اس کو گوارا کرتے ہیں۔" تو ان گستاخیوں کو نظر انداز کرنے کا سبب یہ تھا کہ اپنی توہین کو معاف کر دینا آپ کا حق تھا، آپ چاہتے تو اس کا پورا بدلہ لیتے اور چاہتے تو اسے چھوڑ دیتے، تاہم آپ کی اُمت کے لئے آپ کے حق کی تکمیل چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں۔ مزید برآں اس جیسے واقعات اوّلین دور کے ہیں جب آپ ﷺ معافی اور درگزر کرنے کا حکم دیے گئے تھے۔ اس وقت آپ تالیفِ قلب، کلمہ اسلام کو مجتمع رکھنے اور لوگوں کے متنفر ہو جانے کے ڈر سے معافی کا راستہ اختیار کیا کرتے اور اس لئے بھی کہ دشمن یہ نہ کہتے پھریں کہ آپ تو اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ الغرض شتم رسول پر تمام قسم کی معافیاں آپ کی حیاتِ طیبہ سے ہی مخصوص ہیں۔"

۳۔ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے مجوزہ احتیاطیں

① جہاں یہ جرم بڑا سنگین ہے، وہاں اس کا اطلاق بھی بڑی احتیاط کا متقاضی ہے۔ جب اور جس جگہ بھی اس جرم کا اطلاق کیا جائے، وہاں ضروری ہے کہ اہانتِ رسول کا جرم واقعتاً صراحت کے ساتھ موجود ہو۔ بسا اوقات اپنے ذاتی رجحانات سے بعض لوگ پیغمبر اسلام کا ایک تقدس تشکیل دے لیتے ہیں اور پھر اس اپنے بنائے ہوئے تصور کے خلاف جب کوئی بات کرے تو اس کو توہین رسالت کا مجرم قرار دے دیا جاتا ہے، سو اس سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ نبی کریم ﷺ کی شان اقدس وہی ہے جس کو قرآنِ کریم اور آپ کی احادیثِ مبارکہ نے بیان کیا۔ اپنے پاس سے آپ کی شان و مقام کو متعین کر لینے سے بحث کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ آپ ﷺ کو بشر کہنا توہین بنا لیتے ہیں جبکہ

---

۱ زاد المعاد از علامہ ابن قیم جوزیہ: ۵۹/۵

قرآن وحدیث میں متعدد مقام پر آپ کو بشر قرار دیا گیا ہے، پھر 'عید میلاد النبی ﷺ' کے اشتہار کو پھاڑنا بھی توہین رسالت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ توہین رسالت کے جرم کی تحقیق کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ مختلف مسالک کے منتخب علما کا ایک بورڈ اس جرم کا جائزہ لے اور اس سے قبل کسی کے لئے اس جرم کا الزام بھی جائز نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ جس شخص پر بھی یہ الزام لگا دیا جاتا ہے، لوگ اپنے تئیں جذباتی ہو کر اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے میں جلدی کرتے ہیں، اور یہ سراسر قابل اصلاح رویہ ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کے جرائم کے لئے تھانے میں ایف آئی آر کے اندراج کے بجائے، ہر ضلع کی سطح پر متعین کردہ علما کے ہاں رپورٹ ہو، یا تھانے صرف اس کو فارورڈ کرنے کا کردار ادار کریں، لیکن اس جرم کا اندراج صوبائی سطح پر جملہ مسالک کے معتمد علما کے ایک بورڈ کے پاس ہو جسے صوبائی وزارتِ مذہبی امور کے متحدہ علما بورڈ کے ساتھ ہی تشکیل[1] دیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک حساس جرم کا امکان و تعین بھی علمی اہلیت کا متقاضی[2] ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل نفرت آمیز کتب پر گرفت کا مسئلہ بھی تھانوں کی بجائے متحدہ علما بورڈ کے سپرد کیا گیا ہے، تاکہ پولیس کی من مانی اور لوگوں کی من پسند خواہشات کا راستہ بھی روکا جاسکے۔ یہ طریق کار صرف اس جرم کے اندراج کے لئے ہے، پھر علما بورڈ کے ہاں اندراج ہو جانے کے بعد وفاقی شرعی عدالت میں جرم کی نوعیت اور اس کی سزا یا بریت کا پورا قضیہ مکمل کیا جائے۔

② کسی شخص پر توہین رسالت کے الزام کے ثبوت کے لئے ان مراحل کا بھی جائزہ لیا جائے جن کو ایک جج جرم کے وقوع کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایسا کرنے والے کی نیت اور ذہنی کیفیت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کیونکہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے اور سبقتِ لسانی یا 'شرعاً معتبر ارادے کے بغیر' ہو جانے والی گستاخی کا پہلو بھی نظر انداز نہ کیا جائے، اور ایسا کرنے والے کے دیگر رجحانات و معمولات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جیسا کہ پاکستانی قانون میں بھی 'قصداً' کی شرط موجود ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص دین گریز رجحانات کا مالک ہو تو اس کو نیت یا ارادے کا فائدہ نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ امام تقی الدین علی سبکی شافعی (م۷۵۶ھ) لکھتے ہیں:

وَقَدْ ذَكَرْت فِي كِتَابِي الْمُسَمَّى بِالسَّيْفِ الْمَسْلُولِ أَنَّ الضَّابِطَ أَنَّ مَا قُصِدَ بِهِ أَذَى النَّبِيِّ ﷺ فَهُوَ مُوجِبٌ لِلْقَتْلِ كَعَبْدِ اللهِ بْنِ أُبَيٍّ وَمَا لَمْ يُقْصَدْ بِهِ أَذَى النَّبِيِّ ﷺ لَا

---

۱ ایسی ہی سفارش علمائے کرام کے اس مراسلے میں بھی ملاحظہ کریں جو سینٹ کو بھیجا گیا۔ شمارہ ہذا: ص۳۹

۲ جیسا کہ صحابہ کرام بھی ایسے واقعات کے سلسلے میں نبی ﷺ سے پہلے فیصلہ کرواتے تھے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

يُوجِبُ الْقَتْلَ كَمِسْطَحٍ وَحَمْنَةَ. أَمَّا سَبُّ النَّبِيِّ ﷺ فَالْإِجْمَاعُ مُنْعَقِدٌ عَلَى أَنَّهُ كُفْرٌ، وَالِاسْتِهْزَاءُ بِهِ كُفْرٌ.[1]

"میں نے اپنی کتاب 'السیف المسلول' میں یہ اُصول پیش کیا ہے کہ جو شخص کسی فعل سے نبی کریم ﷺ کو اذیت دینا چاہتا ہو تو ایسا بد بخت واجب القتل ہے، جیسا کہ عبداللہ بن اُبی تھا اور جس شخص کا یہ ارادہ نہ ہو تو اس صورت میں اس کی سزا قتل نہیں ہوگی جیسا کہ مسطح اور حمنہ کا معاملہ ہے[جنہوں نے سیدہ عائشہؓ پر افک میں شرکت کی تھی]۔ جہاں تک شتم رسول کی بات ہے تو اس فعل کے کفر ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور آپ ﷺ کا تمسخر اُڑانا بھی کفر ہی ہے۔"

☜ چنانچہ کعب بن اشرف کو توہین رسالت کے بعد نبی کریم ﷺ کے حکم کی بنا پر قتل کرنے والے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایسے ناروا کلمات بولے تھے جس سے ان کا مقصد کعب بن اشرف کے قتل کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ چونکہ اُن کی نیت غلط نہ تھی، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اُنہیں اُس کی اجازت دی:

فَقَامَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ! أَتُحِبُّ أَنْ أَقْتُلَهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ». قَالَ: فَأْذَنْ لِي أَنْ أَقُولَ شَيْئًا قَالَ: «قُلْ». فَأَتَاهُ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ. فَقَالَ: إِنَّ هَذَا الرَّجُلَ قَدْ سَأَلَنَا صَدَقَةً وَإِنَّهُ قَدْ عَنَّانَا وَإِنِّي قَدْ أَتَيْتُكَ أَسْتَسْلِفُكَ قَالَ وَأَيْضًا وَاللهِ لَتَمَلُّنَّهُ قَالَ إِنَّا قَدْ اتَّبَعْنَاهُ فَلَا نُحِبُّ أَنْ نَدَعَهُ حَتَّى نَنْظُرَ إِلَى أَيِّ شَيْءٍ يَصِيرُ شَأْنُهُ[2]

"محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ اجازت دیں گے کہ میں اسے قتل کر آؤں؟ آپ نے فرمایا، ہاں مجھے یہ پسند ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا: پھر آپ مجھے اجازت عنایت فرمائیں کہ میں اس سے کچھ باتیں کہوں۔ آپ نے اُنہیں اجازت دے دی۔ اب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب بن اشرف کے پاس آئے اور اس سے کہا: یہ شخص (اشارہ حضور اکرم ﷺ کی طرف تھا) ہم سے صدقہ مانگتا رہتا ہے اور اس نے ہمیں تھکا مارا ہے، اس لیے میں تم سے قرض لینے آیا ہوں۔ اس پر کعب نے کہا، ابھی آگے دیکھنا، خدا کی قسم! بالکل اکتا جاؤ گے۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا، چونکہ ہم نے بھی اب ان کی اتباع کر لی ہے، اس لیے جب تک یہ نہ کھل جائے کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے، انہیں چھوڑنا بھی مناسب نہیں۔"

---

۱ فتاوی سبکی: ۲/۵۷۳، ناشر دار المعارف

۲ صحيح البخاري :كِتَابُ المَغَازِي، بَابُ قَتْلِ كَعْبِ بْنِ الأَشْرَفِ: رقم ۴۰۳۷

معلوم ہوا کہ ناروا الفاظ میں نیت کا اعتبار ہوتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے۔

☜ جب تک اہانتِ رسول صریح نہ ہو تو اس وقت تک بھی سزاے قتل حتمی نہیں ہوتی، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ بن مالک کی یہ حدیث بیان کی ہے:

يَقُولُ مَرَّ يَهُودِيٌّ بِرَسُولِ اللهَ ﷺ فَقَالَ: السَّامُ عَلَيْكَ. فَقَالَ رَسُولُ الله ﷺ: «وَعَلَيْكَ» فَقَالَ رَسُولُ الله ﷺ: «أَتَدْرُونَ مَا يَقُولُ، قَالَ السَّامُ عَلَيْكَ». قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! أَلَا نَقْتُلُهُ؟ قَالَ: «لَا، إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَهْلُ الْكِتَابِ فَقُولُوا وَعَلَيْكُمْ»[1]

"ایک یہودی نبی ﷺ پر گزرا، کہنے لگا: السَّام علیك یعنی تم مرو۔ آنحضرت ﷺ نے جواب میں صرف وَعَلَيْكَ کہا (تو بھی مرے گا)۔ پھر آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: تم کو معلوم ہوا، اس نے کیا کہا؟ اس نے السَّام علیك کہا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! (حکم ہو تو) اُس کو مار ڈالیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ جب اہل کتاب یہود اور نصاریٰ تم کو سلام کیا کریں تو تم اتنا ہی کہا کرو: وَعَلَيكُم"

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کرکے بَابُ إِذَا عَرَّضَ الذِّمِّيُّ وَغَيْرُهُ بِسَبِّ النَّبِيِّ ﷺ وَلَمْ يُصَرِّحْ نَحْوَ قَوْلِهِ: السَّامُ عَلَيْكَ "جب کوئی غیر مسلم نبی کریم ﷺ کی ایسی توہین کرے جس میں صراحت نہ ہو مثلاً السام علیك وغیرہ کہنا" اور اس کے بعد مذکورہ حدیث بیان کرکے یہ استدلال کیا ہے کہ غیر واضح توہین کو بھی نظر انداز کیا جائے گا۔

اور درج ذیل احادیث بھی اسی سے ملتی جلتی ہیں جن میں قابل سزا توہین کے بارے میں اشکال پایا جاتا تھا، چنانچہ ایک شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے یمن سے بھیجے ہوئے سونے کی تقسیم کے وقت محروم ہونے پر نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا تو سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے اجازت مانگی:

كُنَّا نَحْنُ أَحَقَّ بِهَذَا مِنْ هَؤُلاَءِ، قَالَ :فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ:«أَلاَ تَأْمَنُونِي وَأَنَا أَمِينُ مَنْ فِي السَّمَاءِ، يَأْتِينِي خَبَرُ السَّمَاءِ صَبَاحًا وَمَسَاءً»، ... فَقَالَ يَا رَسُولَ الله اتَّقِ اللهَ، قَالَ: «وَيْلَكَ، أَوَلَسْتُ أَحَقَّ أَهْلِ الأَرْضِ أَنْ يَتَّقِيَ اللهَ» قَالَ: ثُمَّ وَلَّى الرَّجُلُ، قَالَ خَالِدُ بْنُ الوَلِيدِ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَلاَ أَضْرِبُ عُنُقَهُ؟ قَالَ: «لاَ، لَعَلَّهُ أَنْ يَكُونَ يُصَلِّي» فَقَالَ خَالِدٌ :وَكَمْ مِنْ مُصَلٍّ يَقُولُ بِلِسَانِهِ مَا لَيْسَ فِي قَلْبِهِ، قَالَ رَسُولُ اللهِ

---

[1] صحيح البخاري :كِتَابُ اسْتِتَابَةِ الْمُرْتَدِّينَ وَالْمُعَانِدِينَ وَقِتَالِهِمْ: بَابُ إِذَا عَرَّضَ الذِّمِّيُّ وَغَيْرُهُ بِسَبِّ النَّبِيِّ ﷺ وَلَمْ يُصَرِّحْ نَحْوَ قَوْلِهِ: السَّامُ عَلَيْكَ، رقم ٦٩٢٦

ﷺ: «إِنِّي لَمْ أُومَرْ أَنْ أَنْقُبَ عَنْ قُلُوبِ النَّاسِ وَلاَ أَشُقَّ بُطُونَهُمْ»[1]

"ان لوگوں سے زیادہ ہم اس سونے کے مستحق تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے حالانکہ اس اللہ نے مجھ پر اعتبار کیا ہے جو آسمان پر ہے اور اس کی جو آسمان پر ہے وحی میرے پاس صبح و شام آتی ہے۔"... ایک شخص کہنے لگا: یارسول اللہ! "اللہ سے ڈریے۔" آپ نے فرمایا: افسوس تجھ پر، کیا میں اس روئے زمین پر اللہ سے ڈرنے کا سب سے زیادہ مستحق نہیں ہوں۔ پھر وہ شخص چلا گیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں کیوں نہ اس شخص کی گردن مار دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں شاید وہ نماز پڑھتا ہو۔ اس پر خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جو زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے دل میں وہ نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا: مجھے اس کا حکم نہیں ہوا کہ لوگوں کے دلوں کی کھوج لگاؤں اور نہ اس کا حکم ہوا کہ ان کے پیٹ چاک کروں۔"

اور سیدنا عمرؓ بن خطاب نے بھی ایسے ہی ایک واقعے میں نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا:

بَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ يَقْسِمُ جَاءَ عَبْدُ اللهِ بْنُ ذِي الْخُوَيْصِرَةِ التَّمِيمِيُّ فَقَالَ اعْدِلْ يَا رَسُولَ اللهِ فَقَالَ «وَيْلَكَ وَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ أَعْدِلْ» قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: دَعْنِي أَضْرِبْ عُنُقَهُ قَالَ: «دَعْهُ فَإِنَّ لَهُ أَصْحَابًا يَحْقِرُ أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ مَعَ صَلَاتِهِ وَصِيَامَهُ مَعَ صِيَامِهِ يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ...»[2]

"نبی کریم ﷺ تقسیم فرما رہے تھے کہ عبداللہ بن ذی الخویصرہ تمیمی آیا اور کہا: یارسول اللہ! انصاف کیجیے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: افسوس اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نہیں اس کے کچھ ایسے ساتھی ہوں گے کہ ان کی نماز اور روزے کے سامنے تم اپنی نماز اور روزے کو حقیر سمجھو گے لیکن وہ دین سے اس طرح باہر ہو جائیں گے جس طرح تیر جانور میں سے باہر نکل جاتا ہے..."

پیش نظر تینوں واقعات میں (جن میں سے پہلے سے امام بخاری نے بھی استدلال کیا ہے) صحابہ کرام کے نبی ﷺ

---

۱ صحيح البخاري: كِتَابُ المَغَازِي، بَابُ بَعْثِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلاَمُ...: رقم ۴۳۵۱

۲ صحيح البخاري: كِتَابُ اسْتِتَابَةِ المُرْتَدِّينَ وَالمُعَانِدِينَ وَقِتَالِهِمْ: بَابُ مَنْ تَرَكَ قِتَالَ الخَوَارِجِ: رقم ۶۹۳۳

سے دریافت کرنے / اجازت طلب کرنے (أَلَا نَقْتُلُهُ؟، أَلاَ أَضْرِبُ عُنُقَهُ؟ اور دَعْنِي أَضْرِبْ عُنُقَهُ) کا مطلب یہ ہوا کہ قابل سزا توہین کا فیصلہ صحابہ کرام خود ہی نہیں کر لیا کرتے تھے بلکہ نبی کریم (جو قاضی بھی تھے) سے دریافت کرتے تھے۔ چنانچہ توہین رسالت کے سلسلے میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ کیا یہ توہین بنتی بھی ہے یا نہیں؟ اگر یہ قابل سزا توہین نہیں ہے تو پھر نظر انداز کیا جائے۔ مزید برآں آپ سے یہ بھی دریافت کرتے کہ اس کی سزا دی جائے یا نہیں جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے عمل سے پتہ چلتا ہے۔ اور فی زمانہ ان اُمور کا جائزہ لینے کے لئے جمیع مسالک کے مستند علمائے کرام کی ایک مجاز کمیٹی کا ہونا ضروری ہے۔

☜ مذکورہ بالا احادیث کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ ان میں توہین صریح یا قابل سزا نہیں تھی، جیسا کہ ذکر ہوا اور بعض علما نے آخری دو احادیث (سیدنا خالد و عمر) کی دوسری توجیہ یہ بھی کی ہے کہ ان میں توہین رسالت کا ارتکاب تو تھا، تاہم نبی کریم ﷺ نے اُنہیں معاف کیا اور حیاتِ طیبہ میں خود معاف کرنا آپ ﷺ کے لئے ممکن تھا، اب معاف کرنا ممکن نہیں جیسا کہ پیچھے حافظ ابن قیم کا قول گزرا اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی لکھتے ہیں:

ومعلوم أن النيل منه أعظم من انتهاك المحارم لكن لما دخل فيها حقه كان الأمر إليه في العفو أو الانتقام فكان يختار العفو وربما أمر بالقتل إذا رأى المصلحة في ذلك بخلاف ما لا حق له فيه من زنا أو سرقة أو ظلم لغيره فإنه يجب عليه القيام به. وقد كان أصحابه إذا رأوا من يؤذيه أرادوا قتله لعلمهم بأنه يستحق القتل فيعفو هو عنه ﷺ ويبين لهم أن عفوه أصلح مع إقراره لهم على جواز قتله ولو قتله قاتل قبل عفو النبي ﷺ لم يعرض له النبي ﷺ لعلمه بأنه قد انتصر لله ورسوله بل يحمده على ذلك ويثني عليه كما قتل عمر رضي الله عنه الرجل الذي لم يرضى بحكمه وكما قتل رجل بنت مروان وآخر اليهودية السابة فإذا تعذر عفوه بموته ﷺ بقي حقا محضا لله ولرسوله وللمؤمنين لم يعف عنه مستحقه، فتجب إقامته.[1]

"ظاہر ہے کہ اہانتِ رسول کا ارتکاب محرماتِ الٰہیہ کو پامال کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے تاہم جب اس میں آپ ﷺ کا حق داخل ہے، تو معاف کرنا یا بدلہ لینا آپ کی صوابدید ٹھہرا۔ سو نبی کریم ﷺ کبھی

١ الصارم المسلول: ص ٢٣٥

معاف فرما دیتے، اور جب قرین مصلحت سمجھتے تو قتل کا بھی حکم دیا کرتے، بر خلاف چوری، زنا اور دوسروں پر ظلم وغیرہ جرائم کے، کہ ان کی سزا دینا آپ ﷺ پر (بحکم الٰہی) واجب تھا۔
اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کسی شخص کو آپ کو اذیت دیتا دیکھتے تو اس کو مستحق قتل سمجھتے ہوئے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیتے تو آپ ﷺ اس کو نظر انداز کرتے اور جوازِ قتل کو بر قرار رکھتے ہوئے یہ واضح فرما دیتے کہ اس کو معاف کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اگر کوئی صحابی نبی کریم ﷺ کی معافی سے پہلے ہی قتل کر دیتا، تو نبی کریم ﷺ اس بنا پر اس کو تنبیہ نہ فرماتے کہ اس نے دراصل اللہ اور اس کے رسول کی مدد کی ہے، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو قتل کر دیا جو نبی کریم ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ تھا، اور ایک صحابی نے مشرکہ عصما[2] بنتِ مروان اور دوسرے نے شاتمہ یہودیہ[3] کو قتل کر دیا۔ الغرض نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جب آپ کا معافی دینا ممکن نہ رہا تو یہ صرف اللہ، رسول اور مؤمنین کا حق بن گیا جس کے حق دار اَب معاف نہیں کر سکتے، چنانچہ توہین رسالت پر سزائے موت کو نافذ کرنا واجب ہو گیا۔"

③ قانون کو ہاتھ میں لینے کے جواز کا مسئلہ: لوگوں میں یہ علم اور موقف عام کیا جائے کہ توہین رسالت کے حوالے سے قانون کو ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ اور اس سلسلے میں کوئی آیتِ کریمہ یا حدیثِ مبارکہ ایسی نہیں جو عام شخص کو توہین رسالت پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت یا حکم دینے پر مشتمل ہو۔ بلکہ نبی

---

۱ اس واقعہ کے بعد حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا: وهو أثر غريب مرسل، وابن لهيعة ضعيف اور تفسیر کشاف کی روایات کی تحقیق کرتے ہوئے حافظ زیلعی لکھتے ہیں: وهو مرسل، وابن لهيعة ضعيف. چنانچہ یہ روایت اِرسال اور ابن لہیعہ کے ضعف کی بنا پر غیر مقبول ہے جبکہ اس کی یہی ایک سند ہے اور کلبی کے طریق سے آنے والی سند منقطع ہے اور کلبی خود بھی متہم بالکذب ہے۔ اور حافظ ابن تیمیہ اس قصہ کو ذکر کر کے امام احمد کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ میں ابن لہیعہ کی روایات کو تائید سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا اور اس کی روایت اکیلے معتبر نہیں۔ كأني أستدل به مع غيره يشده لا أنه حجة إذا انفرد (الصارم:۳۹)

۲ قَالَ: نَعَمْ بِأَبِي أَنْتَ يَا رَسُولَ الله... فَالْتَفَتَ النَّبِيّ ﷺ إِلَىٰ مَنْ حَوْلَهُ فَقَالَ: «إِذَا أَحْبَبْتُم أَنْ تَنْظُرُوا إِلَى رَجُلٍ نَصَرَ اللهَ وَرَسُولَهُ بِالْغَيْبِ فَانظُرُوا إِلَى عُمَيْرِ بْنِ عَدِيّ» (المغازی للواقدی: ۱/ ۱۷۴، الصارم المسلول: ۱/ ۱۰۴) اس روایت کو ابن الجوزی نے الموضوعات میں بیان کیا۔ (۱۸/۳)، شیخ البانی نے السلسلہ الضعیفہ میں ۶۰۱۳ کے تحت موضوع قرار دیا۔ اس کی تمام اسناد میں محمد بن حجاج ہے جسے امام بخاری نے منکر الحدیث، ابن معین نے کذاب خبیث، دار قطنی نے کذاب اور ابن عدی نے واضع حدیث بتایا ہے۔ مزید تفصیل دیکھیں: 'اسلام سوال وجواب': ۱۷۷۶۸۴

۳ سنن ابو داود: ۴۳۶۲، السنن الکبری للبیہقی: ۱۳۳۷۶... تاہم یہ واقعہ سنداً ثابت شدہ نہیں ہے جیسا کہ شیخ البانی نے ارواء الغلیل میں ۱۲۵۱ کے تحت اس کی اسناد بیان کیں اور ضعیف ابو داود میں اس کو بوجہ انقطاعِ سند 'ضعیف الاسناد' قرار دیا ہے۔

کریم ﷺ نے قانون کو ہاتھ میں لینے کی صریحاً اجازت نہیں دی، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ الْأَنْصَارِيَّ، قَالَ: يَا رَسُولَ الله، أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَجِدُ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا أَيَقْتُلُهُ؟ قَالَ رَسُولُ الله ﷺ: «لَا». قَالَ سَعْدٌ: بَلَى، وَالَّذِي أَكْرَمَكَ بِالْحَقِّ، فَقَالَ رَسُولُ الله ﷺ: «اسْمَعُوا إِلَى مَا يَقُولُ سَيِّدُكُمْ» [1]

"سعد بن عبادہ انصاریؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر آدمی کو دیکھ لے تو کیا اسے قتل کر دے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ سعد بولے: کیوں نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق مبعوث کیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے کہا: سنو! تمہارا سردار (سعد) کیا کہتا ہے۔"

گویا آپ ﷺ نے سیدنا سعد بن عبادہ کو قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہ دی۔ جب اسلام میں قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوئی گنجائش نہیں اور اس سلسلے میں آنے والی احادیثِ مبارکہ[2] سے اسی قدر علم ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا ابو بکرؓ صدیق کے واقعے میں بھی ابو برزہؓ نے گردن مارنے کی اجازت طلب کی تھی، نہ کہ خود اقدام کر دیا تھا۔ تو اس سلسلے میں قانون کو ہاتھ میں لینے والوں سے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں گے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ کیونکہ اگر یہ ہر مسلمان پر واجب ہوتا یا اس کا جواز ہوتا تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس میں پہل کرنی چاہئے تھی کیونکہ حبِ رسول میں وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے، اور سزا نہ دینے والے صحابہ کو کوتاہی کا مرتکب ٹھہرنا چاہئے تھا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ غرض یہ مسلّمہ شرعی مسئلہ ہے کہ سزاؤں کو نافذ کرنا حاکم کا ہی فرض ہے:

i. توہین رسالت کی سزا ایک شرعی حد ہے اور حدود کا نفاذ حاکم وقت کا ہی فریضہ ہے۔

ii. امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کے اس باب میں اپنے اسی رجحان کو بیان کیا ہے:

بَابُ الحَاكِمِ يَحْكُمُ بِالقَتْلِ عَلَى مَنْ وَجَبَ عَلَيْهِ، دُونَ الإِمَامِ الَّذِي فَوْقَهُ

---

۱ صحیح مسلم: رقم ۱۴۹۸، کتاب الطلاق، باب انقضاء عدۃ المتوفی عنہا زوجہا

۲ نبی کریم ﷺ کے سامنے یہودی لڑکے اور شادی شدہ عورت کا بدکاری کا واقعہ پیش کیا گیا اور ایک شخص بولا: فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللهِ، وَأْذَنْ لِي (بخاری: ۲۷۲۴ و مسلم) "ہمارے مابین فیصلہ کریں اور مجھے اجازت دیں۔" یہی واقعہ ابن عمر سے بھی مروی ہے جس میں عبداللہ بن سلام نے یہودیوں سے تورات پر سے ہاتھ اُٹھانے کو کہا۔ (بخاری: ۴۵۵۶ و مسلم) سیدنا عمر نے حاطب بن ابی بلتعہ کے بارے میں دوبار نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگی: فَعَادَ عُمَرُ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ، قَدْ خَانَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالْمُؤْمِنِينَ، دَعْنِي فَلِأَضْرِبْ عُنُقَهُ (بخاری: ۶۹۳۹) استدلال یوں ہے کہ دورِ نبوی میں لوگ خود فیصلہ کر لینے کے بجائے نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر فیصلہ کرواتے اور اجازت طلب کیا کرتے۔

یعنی "سزا کو حاکم ہی نافذ کرتا ہے، تاہم ماتحت حاکم اس سزا کو بڑے حاکم کو بتانے کا پابند نہیں۔"

iii. محدث امام ابو بکر بن ابی شیبہ نے دو باب قائم کر کے اپنے رجحان اور متعدد آثار کو پیش کیا:

الدم يقضي فيها الأمراء اور الحدود إلى الإمام[1]

"خون کا فیصلہ حکام ہی کریں گے اور حدود کو حاکم کے سپرد کیا جائے۔

iv. امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا يقيم الحد على الأحرار إلا الإمام ومن فوض إليه الإمام."

"آزاد لوگوں پر حد صرف حاکم ہی قائم کر سکتا ہے، یا وہ جس کو حاکم یہ ذمہ داری تفویض کر دے۔"

v. اور شافعیہ میں امام یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶ھ) نے باب کا عنوان یوں قائم کیا ہے:

لا يقيم الحد على الأحرار إلا الإمام ومن فوض إليه الإمام، لأنه لم يقم حد على حرّ على عهد رسول الله ﷺ إلا بإذنه ولا في أيام الخلفاء إلا بإذنهم، ولأنه حق لله تعالىٰ يفتقر إلى الاجتهاد ولا يؤمن في استيفائه الحيف فلم يجز بغير إذن الامام.[2]

"آزاد لوگوں پر صرف حاکم ہی حد قائم کر سکتا ہے، یا وہ شخص جس کو حاکم یہ فرض تفویض کر دے کیونکہ نبی کریم کے دور میں آپ کی اجازت کے بغیر اور خلفاے راشدین کے دور میں ان کی اجازت کے بغیر آزاد شخص پر کوئی حد قائم نہیں کی گئی۔ مزید برآں یہ اللہ کا حق ہے جو اجتہاد کا متقاضی ہے۔ اور اسکو پورا کرنے میں ملامت ر دباؤ کے بغیر چارہ ہے۔ سو حاکم کی اجازت کے بغیر حد لگانا جائز نہیں۔"

vi. ایک اور مقام پر امام نووی مزید لکھتے ہیں:

ولايجوز استيفاء القصاص إلا بحضرة السلطان لانه يفتقر إلى الاجتهاد ولا يؤمن فيه الحيف مع قصد التشفي، فإن استوفاه من غير حضرة السلطان عزّره على ذلك.

"حاکم کی موجودگی کے بغیر قصاص لینا جائز نہیں کیونکہ یہ اجتہاد کا محتاج ہے۔ اور اصلاحِ معاشرہ کی غرض کے باوجود اس کے نفاذ میں دباؤ پڑنا لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص حاکم کے بغیر ایسا کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔"

---

۱ مصنف ابن ابی شیبہ: ۶/ ۴۳۰، ۴۲۹ اور ۶/ ۵۰۷

۲ 'المجموع': ۲۰/ ۳۴، اور ۱۸/ ۴۴۸

vii. امام ابو بکر البکری شافعی (م ۱۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:

فلو قتله غيره عُزِّر لافتياته على الإمام[1]

"اگر حاکم کے سوا کوئی اور سزا دے تو حاکم کے حق میں دخل اندازی کی بنا پر اسے تعزیر دی جائے۔"

viii. امام علاء الدین ابو بکر کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

"وأما شرائط جواز إقامتها يعني الحدود ... فهو الإمامة[2]"

"جہاں تو اقامتِ حدود کے جواز کی شرائط کا تعلق ہے تو ان میں حاکم ہونا شامل ہے۔"

ix. امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "خاطب الله المؤمنين بالحدود والحقوق خطابًا مطلقًا كقوله ﴿وَالسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا﴾... قَدْ عُلِمَ أَنَّ الْمُخَاطَبَ بِالْفِعْلِ لَا بُدَّ أَنْ يَكُونَ قَادِرًا عَلَيْهِ وَالْعَاجِزُونَ لَا يَجِبُ عَلَيْهِمْ ... هُوَ فَرْضٌ عَلَى الْكِفَايَةِ مِنْ الْقَادِرِينَ و "الْقُدْرَةُ" هِيَ السُّلْطَانُ؛ فَلِهَذَا: وَجَبَ إقَامَةُ الْحُدُودِ عَلَى ذِي السُّلْطَانِ وَنُوَّابِهِ.[3]

"اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو عمومی خطاب کے ذریعے حدود اور حقوق نافذ کرنے کی ہدایت کی ہے جیسا کہ آیت ﴿وَالسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا﴾ میں ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ حکم کے مخاطب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی قدرت بھی رکھتا ہو اور عاجز شخص پر حکم پورا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ حکم قدرت رکھنے والوں پر ہی فرض ہے اور قدرت سے مراد حاکم ہے۔ چنانچہ حدود کو قائم کرنا حاکم اور اس کے نائبین کا فرض ہے۔"

جہاں تک امام ابن تیمیہ سے منسوب ہے کہ اہانتِ رسول کا مسئلہ اس عام اُصول سے مستثنیٰ ہے اور اس کی دلیل نابینا صحابی کا واقعہ[4] ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے قانون کو ہاتھ میں لینے کی سزا نہیں دی، تو واضح رہے کہ یہ بات درست نہیں بلکہ امام ابن تیمیہ نے نابینا صحابی کے اقدام کی چھ توجیہات کر کے اس اُصولی جواز سے اتفاق نہیں کیا۔ چنانچہ آپ اس حدیث کی پہلی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ عورت باندی تھی اور صحیح احادیث کے

---

۱ إعانة الطالبين: ۱۵۷/۴

۲ بدائع الصنائع: ۵۷/۷، ناشر دار الکتب العلمیہ، طبع دوم ۱۹۸۶ء

۳ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۷۶/۳۴

۴ فقال رسول الله ﷺ: «ألا اشهدوا أن دمها هدر» سنن ابو داود: ۴۳۶۱، سنن نسائی: ۴۰۷۵... (إرواء الغليل: ۹۲/۵) بعض احادیث میں اس صحابی کا نام ابن اُمّ مکتوم بھی آیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے دونوں واقعات کے ایک ہونے کا احتمال بتایا ہے: فهذه القصة يمكن أن تكون هي الأولى ويدل كلام الإمام أحمد (الصارم المسلول: ۶۸)

مطابق[1] باندی کو اس کا مالک خود سزا دے سکتا ہے، جیسا کہ امام شافعی اور امام مالک کا یہی موقف ہے۔ دوسری توجیہ یہ کہ دراصل یہ سزا دینا تو حاکم کا حق ہے اور یہ حاکم کے حق میں دخل اندازی ہے، تاہم حاکم اس دخل اندازی کو معاف کرنے کا مجاز[2] ہے (اگر چاہے تو معاف کرے، چاہے تو سزا دے لے)، چوتھی توجیہ یہ کی ہے کہ ایسا کرنا صرف عہدِ نبوی میں جائز تھا، فی زمانہ اس کی اجازت[3] نہیں ہے۔ الغرض شاتم رسول کو خود قتل کر دینے میں جن واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے، پیش نظر حدیث کے ماسوا باقی سب ہی ضعیف ہیں، جیسا کہ پیچھے حواشی میں تینوں روایات کی وضاحت ہو چکی ہے اور یہ حدیثِ اعمیٰ باندی کے بارے میں ہے اور یہاں قاضی نے اپنے حق میں دخل اندازی کو معاف کیا ہے۔ چنانچہ یہ استثنیٰ کے ثبوت کے لئے کافی دلیل نہیں، اور احتمالات سے استدلال ثابت نہیں ہوتا۔ مزید پیچھے تین مستند احادیث بھی گزری ہیں جن میں توہین رسالت کے صدور یا اس کی سزا کے بارے میں نبی ﷺ سے استفسار کرنا ثابت ہے۔ واللہ اعلم

یہی موقف فی زمانہ مکہ مکرمہ کے نامور عالم شیخ محمد صالح المنجد نے بھی اختیار کیا ہے، فتویٰ لکھتے ہیں:

المحاكمة العادلة لمن يسب النبي ﷺ ليست قولا لبعض العلماء ، بل هي قول عامتهم؛ لأنهم متفقون على أن إقامة الحدود شأن الإمام أو الحاكم أو نائبه، وهو لا يقيمها إلا بقضاء القاضي الذي يتولى الفصل في شؤون العباد في الدنيا.

وقد كان النبي هو من يتولى القضاء بين الناس، ويتولى الحكم في أقوالهم وأفعالهم فلما توفي ﷺ كان ذلك للقضاة من الصحابة والتابعين والأئمة من بعده.

والمصلحة الشرعية تقضي بذلك على وجه القطع أيضا ؛ إذ لو تُرك الأمر للناس ، يضرب كل منهم عنق من ارتد عن الدين بزعمه ، أو يقيم الحد على من وقع في

---

١ «أقيموا الحدود على ما ملكت أيمانكم» [رواه أحمد (٧٣٦) وغيره وحسّنه الأرناؤوط لغيره، ومال الألباني إلى أن هذه الجملة من كلام علي، كما في الإرواء (٢٣٢٥)]، وقوله ﷺ: «إذا زنت أمة أحدكم فليحدها» [رواه أبو داود (٤٤٧٠) وهو في الصحيحين بلفظ: "فليجلدها الحد" (البخاري:٢٢٣٤)]، ولا أعلم خلافا بين فقهاء الحديث أن له أن يقيم عليه الحد، مثل حد الزنا و القذف و الشرب. (الإسلام سؤال وجواب: رقم١٠٣٧٣٩) ... يقول الشيخ ابن تيمية: "وصحّ عن حفصة أنها قتلت جارية لها اعترفت بالسحر" (الصارم المسلول: ٢٨٦)

٢ الوجه الثاني: أن ذلك أكثر ما فيه أنه افتئات على الإمام والإمام له أن يعفو عمن أقام حدّا واجبا دونه.

٣ الوجه الرابع: أن مثل هذا قد وقع على عهد رسول الله ﷺ... (الصارم المسلول:٢٨٦)

الفاحشة، لسالت الدماء في المجتمع، واضطربت أحوال الناس، ودبت الفوضى في شؤونهم وأمورهم.

وحوادث السيرة أو السنة النبوية المشار إليها في السؤال تتوافق مع هذا التأصيل ولا تتعارض، بل هي التي دلت عليه؛ فالنبي ﷺ كان هو الذي يأمر بإقامة الحد أو بقتل من يستحق القتل بعد ثبوت ذلك عليه، وقد كان للنبي ﷺ في حياته مقام القضاء، ومقام الولاية ومقام الحكم وغيرها إلى جانب مقام النبوة المعصوم.

قال شيخ الإسلام ابن تيمية رحمه الله في "الصارم المسلول " :"فالنبي ﷺ لم يكن يقيم الحدود بعلمه، ولا بخبر الواحد، ولا بمجرد الوحي، ولا بالدلائل والشواهد، حتى يثبت الموجب للحد، ببينة أو إقرار"

فمن يفتئت على القضاء الشرعي اليوم، ويقيم الحدود بنفسه بدعوى ما وقع من حوادث في السنة النبوية ، فقد تمسك بمنطق ضعيف، وحجة واهية[1].

"شاتم رسول کا (خود) عادلانہ فیصلہ کر دینا' علما کا موقف نہیں، بلکہ عوام الناس کی رائے ہے کیونکہ علما تو اس پر متفق ہیں کہ یہ خلیفہ، حاکم یا اس کے نائب کا ہی کام ہے۔ اور اس سزا کو بھی قاضی کے فیصلے سے ہی نافذ کیا جانا چاہیے جو دنیا میں لوگوں کے معاملات کا ذمہ دار ہے۔ نبی کریم بھی لوگوں کے مابین فیصلہ فرمایا کرتے، اور ان کے اقوال وافعال کا فیصلہ کرتے۔ جب آپ فوت ہوگئے تو یہ صحابہ وتابعین اور حکام کا کام تھا۔ شرعی مصلحت بھی حتمی طور پر اسی کی متقاضی ہے کیونکہ اگر یہ معاملہ لوگوں کے سپرد کر دیا گیا، تو ہر شخص اپنے زعم کے مطابق اسلام سے مرتد کو قتل کرنے لگے گا، جو بھی شخص بے حیائی کا ارتکاب کرے، اس پر حد نافذ کردے گا، ایسے تو معاشرے میں خون بہنا شروع ہو جائے گا، لوگوں کے حالات مضطرب اور ان کے معاملات ومسائل میں بدامنی پھیل جائے گی۔

سیرت اور سنتِ نبویہ میں مذکور واقعات جن کا سوال میں تذکرہ ہے، وہ اس بنیاد سے متفق ہیں، متعارض نہیں بلکہ ان سے یہی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ ہی اقامتِ حد کا حکم دیا کرتے، اور ثبوت پورا ہونے کے بعد مستحق قتل کے قتل کا حکم دیتے۔ نبی کریم اپنے دور میں نبوتِ معصومہ کے

---

[1] فتویٰ 'الاسلام سؤال وجواب': نمبر ۲۲۸۴۸۲... هل يجوز لآحاد الناس قتل المرتد دون حكم القضاء نیز فتوی نمبر ۱۰۳۷۳۹ حول حديث الاعمى الذى قتل أم ولده میں انہوں نے امام ابن تیمیہ کی حدیثِ اعمیٰ پر چھ توجیہات سے اتفاق کیا ہے۔

ساتھ ساتھ قاضی، حاکم اور فیصلے کے مناصب پر بھی فائز تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ 'الصارم المسلول' میں کہتے ہیں: "نبی کریم ﷺ محض اپنے علم یا خبر واحد، یا وحی سے فیصلے نہیں فرمادیتے تھے، نہ ہی نرے دلائل وشواہد سے، حتی کہ گواہی یا اعتراف کے ذریعے سزا کا وجوب ثابت نہ کرلیتے۔" چنانچہ جو شخص آج شرعی فیصلہ سے بالا بالا ہی قانون ہاتھ میں لے، اور سنت نبویہ کے بعض واقعات کے نام پر اپنے تئیں نفاذِ حدود شروع کردے تو اس نے کمزور بات اور بے کار دلیل کو اختیار کیا ہے۔"

چنانچہ امام ابن تیمیہ نے سزا دینا اصلاً حق حاکم قرار دیا ہے اور کہا کہ قاضی چاہے تو اپنے حق کو چھوڑ سکتا ہے، جیسا کہ نابینا صحابی کے واقعے میں ہوا کہ یہ فیصلہ عدالتِ نبوی سے صادر ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ واقعہ، اس جیسے از خود ہوجانے والے حتمی توہین رسالت کے واقعات میں عدالت کے فیصلے کے بعد، قتل کرنے والے سے رعایت کی نظیر بن سکتا ہے، لیکن اس سے بڑھ کر اس سے عدالت سے بالا بالا ہی قبل از واقعہ ایک اُصولی جواز بیان کرنا کہ توہین رسالت پر قانون کو ہاتھ میں لینا جائز ہے، اصل واقعہ سے زائد مطالب کا استخراج ہے۔ اور پیچھے توہین رسالت کے صدور کے سلسلے میں صحابہ کرام کے نبی کریم ﷺ سے استفسارات اور نبی کریم ﷺ سے اجازت لینا بھی ثابت شدہ امر ہے۔ چنانچہ کسی گناہ کی سزا نہ دینے سے اس کا جواز معلوم نہیں ہوجاتا، بلکہ سزا نہ دینے کی بہت سی وجوہات اور حکمتیں ہوسکتی ہیں۔ مذکورہ بالا تفصیل سے علم ہوتا ہے کہ توہین رسالت پر خود سے سزا کی تلقین کرنا، اوّل تو صریح دلائل کا محتاج ہے، اگر اس کے جواز کا کچھ امکان بھی ہو تو ایسا دورِ نبوی میں ہی ہے جیسا کہ امام ابن تیمیہ کا موقف گزرا، کیونکہ اس دور میں اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو حقیقتِ واقعہ سے باخبر کردیتے، صحابہ کرام بھی عادل ہونے کے ناطے جھوٹ سے احتراز کرتے۔ بعد کے اَدوار میں جب لوگوں کے ایمان وتدین کی وہ کیفیت نہ رہی، تو اس وقت اہانتِ رسول پر قانون کو ہاتھ میں لینے کے اُصولی جواز سے گریز ہی ہوگا۔

مزید برآں حاکم کے لئے کسی جرم کی تعزیر قائم کرنا بھی مشروع ہے، اور جب پاکستانی قانون کی رو سے یہ جرم ہے تو پھر پاکستان میں اسے جرم ہی قرار دیا جائے گا۔

④ چونکہ توہین رسالت کا جرم بڑا سنگین ہے اور اس قانون کا ناجائز استعمال بھی بڑھتا جارہا ہے اور ملزم پر اس کے اثرات بھی بڑے سنگین پڑتے ہیں۔ اس لئے ایسے جرم کا الزام اور دعویٰ کرنے والے پر بھی کڑی نگرانی ہونی چاہیے۔ اور اس کو ثابت نہ کرسکنا بھی موجبِ سزا بنایا جاسکتا ہے، جیسا کہ اسلام میں زنا ایک سنگین جرم ہے، اور جو شخص اس جرم کا الزام لگاتا ہے، یا تو وہ چار گواہوں کے ذریعے اسے ثابت کرنے کا

پابند ہے، وگرنہ اس کو تہمت کی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ زنا کا جرم ثابت نہ کر سکنے پر شکایت کرنے والے کو خود تہمت کی سزا کا سامنا کرنا پڑا، جیسا کہ درج ذیل واقعہ ہے جو قسامہ بن زہیر سے مروی ہے:

لَمَّا كَانَ مِنْ شَأْنِ أَبِي بَكْرَةَ وَالْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ الَّذِي كَانَ، قَالَ أَبُو بَكْرَةَ: اجْتَنِبْ أَوْ تَنَحَّ عَنْ صَلَاتِنَا، فَإِنَّا لَا نُصَلِّي خَلْفَكَ، قَالَ: فَكَتَبَ إِلَى عُمَرَ فِي شَأْنِهِ، قَالَ: فَكَتَبَ عُمَرُ إِلَى الْمُغِيرَةِ: «أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّهُ قَدْ رَقِيَ إِلَيَّ مِنْ حَدِيثِكَ حَدِيثٌ، فَإِنْ يَكُنْ مَصْدُوقًا عَلَيْكَ فَلَأَنْ تَكُونَ مِتَّ قَبْلَ الْيَوْمِ خَيْرٌ لَكَ»، قَالَ: فَكَتَبَ إِلَيْهِ وَإِلَى الشُّهُودِ أَنْ يُقْبِلُوا إِلَيْهِ، فَلَمَّا انْتَهَوْا إِلَيْهِ دَعَا الشُّهُودَ، فَشَهِدُوا، فَشَهِدَ أَبُو بَكْرَةَ وَشِبْلُ بْنُ مَعْبَدٍ، وَأَبُو عَبْدِ اللهِ نَافِعٌ، فَقَالَ عُمَرُ حِينَ شَهِدَ هَؤُلَاءِ الثَّلَاثَةُ: "أَوَدُّ الْمُغِيرَةِ أَرْبَعَةٌ، وَشَقَّ عَلَى عُمَرَ شَأْنُهُ جِدًّا. فَلَمَّا قَامَ زِيَادٌ، قَالَ: «إِنْ تَشْهَدْ إِنْ شَاءَ اللهُ إِلَّا بِحَقٍّ» ثُمَّ شَهِدَ، قَالَ: أَمَّا الزِّنَا فَلَا أَشْهَدُ بِهِ، وَلَكِنِّي رَأَيْتُ أَمْرًا قَبِيحًا، فَقَالَ عُمَرُ: «اللهُ أَكْبَرُ، حُدُّوهُمْ، فَجَلَدُوهُمْ» فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ جَلْدِ أَبِي بَكْرَةَ قَامَ أَبُو بَكْرَةَ، فَقَالَ: أَشْهَدُ أَنَّهُ زَانٍ، فَهَمَّ عُمَرُ أَنْ يُعِيدَ عَلَيْهِ الْحَدَّ، فَقَالَ عَلِيٌّ: «إِنْ جَلَدْتَهُ فَارْجُمْ صَاحِبَكَ، فَتَرَكَهُ فَلَمْ يُجْلَدْ، فَمَا قَذَفَ مَرَّتَيْنِ بَعْدُ»[1]

"(آغاز میں ابو بکرہ کے مغیرہ بن شعبہ پر الزام زنا اور اختلافات کا تذکرہ ہے جس کے بعد سیدنا عمر نے انہیں امامت سے منع کر کے گواہوں کو طلب کر لیا۔) سو ابو بکرہ، شبل بن معبد اور ابو عبد اللہ نافع نے گواہی دے دی۔ تین گواہیاں پوری ہونے پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: مغیرہ کی سزا چار گواہیوں پر ہو گی، اور سیدنا عمر کے لئے مغیرہ پر یہ الزام بہت بھاری ہو گیا۔ جب زیاد کھڑا ہوا تو عمر بولے: گواہی صرف حق کی ہی دینا۔ سو زیاد نے یوں گواہی دی کہ "جہاں تک زنا ہے تو میں اس کی تصدیق نہیں کر سکتا، البتہ میں نے ایک قبیح کام دیکھا ہے۔" سیدنا عمر نے کہا: اللہ اکبر! ان تینوں کو تہمت کی حد لگاؤ، سو ان تینوں کو تہمت کی سزا لگی۔ جب ابو بکرہ کو تہمت کے کوڑے لگ گئے تو ابو بکرہ کھڑے ہو گئے اور اصرار کرنے لگے: میں گواہی دیتا ہوں کہ مغیرہ زناکار ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر نے ان پر تہمت کی سزا

---

1 مصنف ابن ابی شیبہ: رقم ۲۸۸۲۴، وعنہ البیہقی: ۸/ ۳۳۵، ۳۳۴ ... شیخ البانی نے اس قصہ کو ارواء الغلیل میں صحیح قرار دیا ہے۔ (ج ۸/ ص ۲۸، رقم ۲۳۶۱)

دہرانے کا ارادہ کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے روکا اور کہا: اگر آپ انہیں دوبارہ تہمت کی سزا لگاتے ہیں تو پھر اس چوتھی گواہی کی بنا پر مغیرہ کو رجم بھی کرنا ہوگا۔ چنانچہ عمر نے ان کو چھوڑ دیا اور دوبارہ کوڑے نہ لگائے۔ چنانچہ دو کے بعد ابو بکرہ نے پھر بہتان نہ لگایا۔"

اس مستند واقعہ[1] سے علم ہوتا ہے کہ غلط الزامِ زنا پر بھی سزائے تہمت کا تصور شریعتِ مطہرہ میں موجود ہے جو کہ بظاہر زنا تک محدود ہے لیکن فی زمانہ اسے اہانتِ رسول کی تہمت تک وسیع کیا جاسکتا ہے، یا اس جرم کے غلط استعمال کی حوصلہ شکنی کے لئے حد قذف کو سامنے رکھتے ہوئے بطورِ تعزیر اُصولی قانون سازی بھی کی جاسکتی ہے۔ کم از کم عدالت ایسے اشخاص کے لئے جو اس قانون کا غلط استعمال کرتے ہیں اور ان کی بدنیتی ثابت ہوجاتی ہے، اور وہ قرائن سے بھی ثابت نہیں کرسکتے کہ توہین رسالت کا جرم واقع ہوا تھا، تو ایسے لوگوں کو کڑی سزا دی جائے کیونکہ وہ لوگوں کے ایمان اور زندگیوں سے کھیلنے کے سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں اور بعض صورتوں میں یہ اقدامِ قتل کی کوشش بھی بن جاتی ہے، جیسا کہ خاں عبد الولی خاں یونیورسٹی کے طالبعلم مشعال خاں کیس کی ابتدائی تفصیلات سے اسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

⑤ توہین رسالت کے جرم کی سنگینی، حساسیت اور عالمی سطح پر باعثِ نزاع ہونے کے ناطے، اس جرم کی فوری، تیز تر اور میڈیا سے بالاتر بند کمرے میں تفتیش کو بھی متعارف کرایا جاسکتا ہے۔

۴۔ قانون کو ہاتھ میں لینے کی سزا کا مسئلہ

توہین رسالت پر قانون کو ہاتھ میں لینا، دراصل دو جرائم ہیں جن میں سے دوسرا جرم (قانون کو ہاتھ میں لینا) پہلے امکانی جرم (توہین رسالت) کے ردّ عمل اور تناظر میں ہو رہا ہے۔ حکومت وعدالت کو چاہیے کہ دونوں جرائم

---

1 ممکن ہے کہ اس واقعہ سے سیدنا مغیرہؓ بن شعبہ کے بارے میں مغالطہ ہو، تو واضح رہے کہ بصرہ میں ان کا اور سیدنا ابو بکرہؓ کا گھر ایک ہی گلی میں تھا۔ چند لوگ ابو بکرہ کے پاس جمع تھے کہ تیز ہوا چلنے سے دروازے کھل گئے، ابو بکرہ جب کھڑکی بند کرنے اُٹھے تو ان کی نظر سیدنا مغیرہ پر پڑی جو اپنی بیوی کے ساتھ مشغول تھے۔ موجود لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ ام جمیل نامی خادمہ عورت ہے۔ گواہی کے موقع پر سیدنا مغیرہ نے یہ استفسار کیا کہ سَلْ هَؤُلَاءِ الْأَعْبُدِ كَيْف رَأَوْنِي مُسْتَقْبِلَهُمْ أَوْ مُسْتَدْبِرَهُمْ، وَكَيْف رَأَوْا الْمَرْأَةَ، وَهَلْ عَرَفُوهَا؟ فَإِنْ كَانُوا مُسْتَقْبِلِيَّ فَكَيْفَ لَمْ أَسْتَتِرْ، أَوْ مُسْتَدْبِرِيَّ فَبِأَيِّ شَيْءٍ اسْتَحَلُّوا النَّظَرَ إِلَيَّ عَلَى امْرَأَتِي، وَاللهِ مَا أَتَيْت إِلَّا زَوْجَتِي، وَكَانَتْ تُشْبِهُهَا. کہ وہ میری بیوی تھی، اور ان لوگوں نے مجھے پیچھے سے دیکھا تو یہ عورت کو دیکھ نہیں پائے، چنانچہ زیاد نے عورت کے بارے میں کنفرم نہ کیا اور گواہی پوری نہ ہوسکی۔ یہ کامل تفصیل اور مکمل واقعہ تفسیر احکام القرآن از ابو بکر بن العربی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ (ج:۳/ ص ۳۴۷، زیر آیت النور:۴)

کے خاتمے کی ذمہ داری قبول کرے، اور دونوں کے انسداد کے لئے اقدامات کرے۔ صرف قانون کو ہاتھ میں لیناہی جرم نہیں بلکہ اس سے سنگین تر جرم اہانتِ رسول کا ہونا بھی ہے اور دونوں کا خاتمہ حکومت کا فرض ہے۔

☜ اگر قانون ہاتھ میں لینے والا، اہانتِ رسول کو ثابت نہ کر سکے تو اس کو قتل کے بدلے قتل کی سزا دی جائے۔ اگر اہانت رسول کے قرائن تو ہوں لیکن قانونی طور پر اس جرم کے تقاضے پورے نہ ہوتے ہوں، تب قانون کو ہاتھ میں لینے والے کو قتل خطا کی سزا دیتے ہوئے، اس پر مقتول کی دیت عائد کی جائے۔ اور اگر توہین رسالت سرے سے موجود ہی نہ ہو بلکہ صرف بدنیتی اور تحکم کی بنا پر ایسا اقدام کیا جائے اور یہ معاشرے کا عام چلن بننا شروع ہو جائے، تب قانون کو ہاتھ میں لینے والے پر فساد فی الارض کی حد یعنی حرابہ کو بھی نافذ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن دراصل ایسے مسائل انہی حالات میں پیدا ہوتے ہیں جب حکومتِ وقت اور انتظامیہ پہلے جرم کے بارے میں غفلت اور بے پروائی برتنا شروع کر دے، جس کے نتیجے میں لوگ از خود قانون کو ہاتھ میں لینے کی روش اختیار کرتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی جرائم پیشہ لوگ اس جرم کے ذریعے ناجائز طور پر لوگوں کو ملوث کر کے قتل وغارت کا ایک نیا بہانہ تراش لیتے ہیں۔ اگر حکومت پہلے جرم کا انسداد نیک نیتی سے کرتی رہے تو معاشرے میں اس کے غلط استعمال کے امکانات درجہ بدرجہ معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں اور دوسرے جرم کا امکان مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔

وہ حدیث جن میں نابینا صحابی نے اپنی بیوی کو خود سے توہین رسالت پر قتل کر دیا، تو نبی کریم ﷺ نے پہلے جرم یعنی توہین رسالت کے وقوع کو جان لینے کے بعد صحابی کو معاف کر دیا، اور اُنہیں قانون کو ہاتھ میں لینے کی سزا نہیں دی۔ تاہم اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے واقعات عدالت سے بالا نہیں، بلکہ ایسے ہر واقعے کا نبی کریم ﷺ نے عدالت میں محاسبہ کر کے عدل وانصاف کے تقاضے[1] پورے کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا، جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اب جہاں تک دوسرے جرم پر نبی کریم ﷺ کے معاف کرنے کا تعلق ہے تو قاضی ہونے کے ناطے عدالت کے پاس یہ حق ہے کہ وہ اپنے حق میں دخل اندازی کو نظر انداز کرے یا اس سلسلے کے بڑھ جانے پر اس کی تعزیری سزا نافذ کرے۔ چنانچہ توہین رسالت پر قانون کو ہاتھ میں لینے کو یوں دیکھا جانا چاہیے کہ

---

[1] 'توہین رسالت پر گرفت کے واقعات' کے لئے راقم نے ایک مستقل مضمون میں ایسی احادیث کو جمع کرنے کے بعد ان کی توجیہ اور قانونی نکات پر مستقل بحث کی ہے۔ (دیکھیں محدث، نومبر ۲۰۱۱ء)

"اہانتِ رسول کی سزا دینا حکومتِ وقت کا فریضہ ہے، اگر حکومت کو اس کا علم نہ ہو یا وہ اس کی سزا میں تاخیر کرے، اور مسلمان خود قانون کو ہاتھ میں لیں تو اُنہیں اُصولاً اسی بات کی تعلیم اور تلقین کی جائے گی کہ انہیں اس کی اجازت نہیں ہے کیونکہ قانون کو ہاتھ میں لینا ناجائز ہے۔ تاہم اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر اس کے قانون کے ہاتھ میں لینے کو پہلے جرم (توہین رسالت) کے تناظر میں دیکھا جائے گا، اور اس کا یوں بھی جائزہ لیا جائے گا کہ ایک شاتم رسول کو سزا دینا یوں تو حکومتِ وقت کا فریضہ تھا لیکن اس کو قانون ہاتھ میں لینے والے نے خود سزا دینے کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے (یہ بھی اس صورت میں جب کہ شتم رسول امر واقعہ میں ثابت ہو جائے)۔ اب عدالت چاہے تو دوسرے جرم کی سزا دے یا اُس کو معاف کر دے۔"[1]

☜ توہین رسالت کے نتیجے میں قانون کو ہاتھ میں لینے والے کو لازماً قاتل قرار دینا درست نہیں بلکہ توہین رسالت کا وقوع اور ثبوت اس کے گناہ (قانون کو ہاتھ میں لینے) کو کمتر کر دے گا اور بعض صورتوں میں وہ معاف بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے مذکورہ بالا عدالتی فیصلے اسی کی تائید کرتے ہیں اور اگر وہ ثابت نہ کر سکا تو وہ قاتل کی سزا پائے گا؛ قتل عمد، قتل خطا یا حرابہ کی، جیسا کہ اس کی تفصیل گزری ہے۔

۵۔ دو طرفہ انتہا پسندی اور اس کی بنیادیں

① توہین رسالت ایک بڑا حساس اور سنگین جرم ہے، اور اگر یہ صریح اور کھلم کھلا ہو تو کم مسلمان ہی اس کو

---

1 اس مضمون کی تکمیل کے بعد مجھے فاضل مکرم علامہ خلیل الرحمٰن قادری (مدیر 'سوئے حجاز' لاہور) کا موقف پڑھنے کا موقع ملا جس میں اُنہوں نے بھی قرار دیا ہے کہ "قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں کیونکہ اگر یہ اجازت ہی دینا مقصود ہوتا تو قانون تحفظِ ناموس رسالت بنانے کی کیا ضرورت تھی؟... علما اپنے خطبوں اور تقریر و تحریر میں کسی کو بھی ماورائے عدالت قتل کی ترغیب نہ دیں نہ ہی ایسے نعرے لگائیں کہ جن سے اشتعال پیدا ہوتا ہے جبکہ اگر کسی کی توہین کا معاملہ ان کے سامنے لایا جائے اور انہیں پورا یقین ہو کہ گستاخی بنتی ہے تو وہ یہی تلقین کریں کہ یہ معاملہ قانون کے سپرد کر دیں بلکہ اندراجِ مقدمہ میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔
اس کے باوجود اگر ایسا معاملہ سامنے آجائے کہ کسی نے کسی دوسرے کو قتل کرنے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ اس نے توہین رسالت پر یہ قتل کیا ہے تو قاتل کی بلا تحقیق حوصلہ افزائی نہ کریں۔ اگر شاتم کو قتل کرنے کا دعویدار عدالت میں معیاری شہادتوں اور ٹھوس ثبوتوں کے ذریعے یہ ثابت نہ کر سکے کہ قاتل نے واقعتاً شاتم کو مارا تھا تو اسے قتل ناحق پر قرارِ واقعی سزا دی جائے۔ اس کے برعکس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مقتول شاتم تھا تو پھر قتل کرنے والے کو قصاص و دیت سے توبری کر دیا جائے لیکن قاضی یا امام (سربراہ) سے سبقت لینے کی بنا پر مناسب تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔... اس طرح شاتم کو ماورائے قانون قتل کرنے والے کو قصاص و دیت سے بریت کا فائدہ تبھی ہو سکے گا جب وہ عدالت میں ثابت کر سکے گا کہ اس نے شاتم کو ہی قتل کیا تھا۔ جس طرح توہین کسی صورت میں برداشت نہیں کی جا سکتی، اسی طرح یہ بھی کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے کہ توہین کا جھوٹا الزام لگا کر قتل کرنے والا سزا سے بچ سکے۔"

برداشت کرتے ہیں۔ ایک طرف یہ اس جرم کی حساسیت اور شدت ہے جس کی وجوہات اس جرم کے تحلیلی تجزیے میں بیان ہو چکی ہیں۔

② دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض لوگ اپنے عقائد کی مخالفت کو توہین مذہب یا توہین رسالت بنا لیتے ہیں اور ان پر مرنے مارنے کو اُتر آتے ہیں۔ اور یہ بھی پاکستانی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ دین کی تعلیمات سے مراد ہماری اپنی ذاتی آرا ہو جاتی ہیں اور ہم ان میں کوئی گنجائش پیدا نہ کرنے اور اپنی رائے تشدد سے ٹھونسنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بہت سے واقعات میں توہین رسالت کا جرم صادر ہی نہیں ہوتا، یا اس کے ثبوت کے قانونی تقاضے پورے نہیں کیے جاتے، اس سے پہلے ہی لوگ قانون کو ہاتھ میں لے کر بلوہ عام کے ذریعے خود سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔ یہ سراسر جذباتی اور انتہا پسندانہ صورتِ حال ہے۔

③ ایک تیسری الم ناک حقیقت یہ بھی ہے کہ پاکستان میں توہین رسالت کا جرم ہو بھی رہا ہے۔ اور مادر پدر آزاد میڈیا کے جدید ذرائع نے اظہار و ابلاغ کے جرائم کو بہت آسان اور عام کر دیا ہے اور ان ذرائع کی پیچیدگی کی بنا پر اصل مجرم کے لئے چھپنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ حال ہی میں بھینسا، موچی نامی بلاگرز کا مسئلہ اسلام آباد ہائی کورٹ میں زیر بحث رہا۔ اور مشعال خاں کیس میں بھی ایسے ہی توہین آمیز تبصرے، مشعال خاں کے قتل کی بنیاد کے طور پر پیش کئے جاتے رہے۔ ان دونوں واقعات میں ہونے والی توہین کی نوعیت، مرتکبِ توہین سے قطع نظر، اس سنگین درجے کی ہے کہ ملزمان اُن کے اعتراف سے مسلسل انکار ہی کرتے رہے۔ گویا توہین تو موجود ہے اور بڑے پیمانے پر پھیل بھی رہی ہے، لیکن اس کے مرتکب کا پتہ نہیں چل رہا۔

④ چوتھی حقیقت یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی طور پر تو یہ جرم گذشتہ ایک عشرے سے معمول بن چکا ہے۔ جس تکرار اور ڈھٹائی کے ساتھ فی زمانہ توہین رسالت کا ارتکاب ہو رہا ہے، اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ بلکہ یہ تہذیبوں کے مابین تصادم کا مرکزی نکتہ بن گیا ہے۔ اس تہذیبی تصادم کی بازگشت پاکستان میں بھی سنائی دیتی رہتی ہے۔ دو عشروں سے نیو ورلڈ آرڈر کے نتیجے میں، امریکی سرپرستی میں جاری عسکری یلغار اور تہذیبی تصادم نے معاشروں میں انتہا پسندی کو فروغ دیا ہے اور یہ انتہا پسندی مختلف سطحوں پر دکھائی دیتی ہے۔

توہین رسالت کے اسی جرم کی بنا پر یوٹیوب جیسی مقبول ترین ویب سائٹ کو کئی سال پاکستان میں عدالتی فیصلے کی بنا پر ممنوع کر دیا گیا، اور اس کے جواز کے لئے اظہارِ رائے کے بے کار استدلال کا سہارا لیا جاتا رہا، حالانکہ

قانونی طور پر ہر ملک میں اظہارِ رائے کا وہی تصور معتبر ہے جو اس ملک کے قانون[1] نے متعین کر دیا اور یوٹیوب جیسے ادارے دیگر ممالک کے قوانین کا احترام کر کے ہی اپنی خدمات میسر کرتے ہیں، جیسا کہ تھائی لینڈ میں یوٹیوب نے تھائی شاہی خاندان کے احترام کو ملحوظ رکھنے کا جب عہد[2] کیا، تبھی اس کو وہاں اپنی سروسز دینے کی اجازت ملی۔ آخر کار یوٹیوب نے جب پاکستان کا مقامی ورژن جاری کیا، تب اس کی انتظامیہ پاکستانی قانون کی اس پابندی کو قبول کرنے کو آمادہ ہوئی۔

پہلی اور دوسری حقیقت تو اس جرم کی حساسیت یا اس کے غلط استعمال کو ظاہر کرتی ہے، جبکہ تیسری اور چوتھی حقیقتیں یہ بتاتی ہیں کہ بہر حال ایسے سنگین جرائم موجود ہیں، اور ان کا انسداد کرنا حکومتِ وقت کا فریضہ ہے۔ یہ آخری دو حقیقتیں پاکستان کے اس قانونِ توہین رسالت کا اُصولی جواز بھی ہیں جن سے ایسے جرائم کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ ان حقائق کو ہم مذہبی انتہاپسندی اور لبرل انتہاپسندی کے نام سے سمجھ سکتے ہیں۔

⑤ پاکستان میں قانونِ توہین کا جواز تو لبرل انتہاپسندی بنی، جیسا کہ اس قانون کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن غور طلب امر یہ بھی ہے کہ پارلیمنٹ سے بنے قانون کو نافذ ہوئے ۲۵ سال ہونے کو آئے اور آج تک اس جرم کی سزا میں کسی کو معمولی سی سزا بھی نہ دی جاسکی، اس پر طرہ یہ کہ ایسے ملزموں کی تائید میں مغرب زدہ این جی اوز اور سول سوسائٹی میڈیا کے سہارے پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور عالمی ادارے اُن کی مدد کو آن پہنچتے ہیں۔ چنانچہ اس نوعیت کے جرم کا ارتکاب کرنے والے اکثر لوگ مغربی اداروں کی آنکھوں کا تارا بن جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ نفاذِ قانون کے فوری بعد ۱۹۹۴ء میں سلامت اور رحمت مسیح کے جرمنی روانگی وغیرہ کے دور سے جاری ہے۔

⑥ اس قانون کی مذمت کرنے میں لبرل انتہاپسند اس لئے بھی دلچسپی اور تیزی دکھاتے اور مغربی عالمی

---

۱ جیسا کہ دستورِ پاکستان کا آرٹیکل نمبر ۱۹ یہ قرار دیتا ہے کہ "ہر شہری کو تقریر، تحریر اور آزادیٔ اظہار کا حق حاصل ہوگا، اور پریس کو آزادی حاصل ہوگی، مگر یہ آزادی اسلام کی عظمت، یا پاکستان یا اس کے کسی حصے کی سالمیت یا سلامتی، دفاع، غیر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات، یا امن عامہ، تہذیب یا اخلاقیات کے مفاد کے پیش نظر یا توہین عدالت کے کسی جرم (کے ارتکاب) یا اس کی ترغیب سے متعلق قانون کے ذریعے عائد کردہ مناسب پابندیوں کے تابع ہوگی۔"

۲ 'بادشاہت کی تضحیک، گوگل مواد ہٹانے پر تیار': یوٹیوب اب گوگل کا حصہ ہے اور گوگل کو ۳۳ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں ۹۷ فیصد کے مطابق تھائی حکومت اور شاہی خاندان کی توہین کی گئی تھی۔ گوگل انتظامیہ کے نمائندے نے خبر رساں ادارے 'روئیٹرز' کو بتایا کہ "جب سرکاری طور پر ہماری توجہ کسی ایسی چیز پر دلائی جاتی ہے تو ہم اس کی پوری جانچ کے بعد ایسے مواد تک اس ملک میں رسائی بند کر دیتے ہیں۔" (ویب سائٹ بی بی سی اُردو: ۲۳ر اکتوبر ۲۰۱۶ء)

ادارے ان کی تائید کو آن موجود ہوتے ہیں، کیونکہ وہ شرعی بنیاد پر کسی قانون کے جواز کے سرے سے ہی قائل نہیں اور مغرب کا نظریۂ سیکولرزم ان کی فکری اساس اور نظریاتی جنت ہے۔ انہیں وہ سیکولر قانون ہی عزیز ہے جسے مجموعہ تعزیرات کے نام پر ۱۸۶۰ء میں لارڈ تھامس میکالے[1] نے برطانوی قانون کو پیش نظر رکھ کر تشکیل دیا تھا۔ اسی بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت کے بنیادی نظریے سے ہی اُنہیں اتفاق نہیں، اس لئے وہ پہلے دن سے اپنے منحرفہ نظریے کے مطابق اسے ظالمانہ عدالت قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر اپنے مغربی آقاؤں سے تائید حاصل کرتے ہیں۔ اس سیکولرزم کو وہ پاکستان کے دستور اور قوانین کے برعکس، اپنے تئیں یہاں نافذ کرنے میں مگن رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستانی قانون میں سیکولرزم کی اُصولی نفی تو بکثرت موجود ہے، لیکن اس کے تقاضوں سے بے خبری اور اشرافیہ کے رجحانات کی بنا پر سیکولرزم کی یہ نفی نمائش سے آگے نہیں بڑھ پائی اور عملاً سیاست، عدالت، معیشت، میڈیا اور تعلیم و معاشرت میں سیکولر نظریات کی ہی عمل داری ہے۔

⑦ ان قوانین توہین کی مذمت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انہی 'قوانین توہین مذہب' میں ان شعائر کے احترام کا قانون (۲۹۵اے اور ۲۹۸بی، سی[2]) بھی ہے جو قادیانیوں کے لئے اسلامی شعائر: مسجد، نماز، صحابی وغیرہ جیسے

---

۱ مجموعہ تعزیرات پاکستان کا بنیادی ماخذ تعزیرات ہند ہے۔ یہ فوجداری قوانین کا ایک جامع مجموعہ ہے جس کا مقصد فوجداری قانون کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرنا ہے۔ اس قانون کا مسودہ ۱۸۶۰ء میں تیار کیا گیا تھا جس کے پیچھے برطانوی بھارت کے پہلے قانونی کمیشن کی سفارشات کارفرما تھیں۔ یہ کمیشن ۱۸۳۴ء میں چارٹر ایکٹ ۱۸۳۳ء کے تحت لارڈ تھامس بابنگٹن میکالے کی صدارت میں قائم ہوا تھا۔ یہ فوجداری قانون برطانوی بھارت میں ۱۸۶۲ء نافذ کیا گیا۔ تعزیراتِ ہند کا مسودہ پہلے قانونی کمیشن کی جانب سے ۱۸۳۴ء میں تیار کیا گیا تھا جس کی صدارت ماہر قانون لارڈ تھامس بابنگٹن میکالے کی تھی۔ اس کی بنیاد انگلستان کا قانون ہے، اس کے کچھ عناصر نپولینی ضابطہ اور ایڈورڈ لیونگسٹن کے ۱۸۲۵ء کے لوزیانا ضابطہ دیوانی سے بھی لیے گئے تھے۔ تعزیراتِ ہند کا حتمی مسودہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو ۱۸۳۷ء میں پیش کیا گیا تھا، مگر مسودے پر نظر ثانی کی گئی تھی۔ مسودے کی نئے سرے سے تیاری ۱۸۵۰ء میں مکمل ہوئی اور اس ضابطے کو قانون ساز کونسل میں ۱۸۵۶ء کو پیش کیا گیا تھا۔ مگر مسودہ کو اس کا مقام نہیں ملا کیونکہ جنگِ آزادی ہند ۱۸۵۷ء کا شورش زدہ دور چل رہا تھا۔ اس مجموعہ تعزیرات کو یکم جنوری ۱۸۶۲ء سے روبہ عمل لایا گیا تھا۔ تاہم لارڈ میکالے اپنا قانونی مجموعہ عملی شکل میں دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا، اس کا انتقال ۱۸۵۹ء میں ہو گیا تھا۔

۲ توہین مذہب کے قوانین میں سے ۲۹۵۔اے کا متن آغاز میں ذکر ہو گیا، مزید آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء کے ذریعے دفعہ ۲۹۸۔اے کا اضافہ ہوا جس کی رو سے "توہین اُمّ المومنین، اہل بیت، خلفائے راشدین یا صحابہ کرام کی توہین کے جرم کی سزا تین سال قید یا جرمانہ یا دونوں" مقرر کی گئی۔ آرڈیننس ون ۱۹۸۲ء کے ذریعے تعزیراتِ پاکستان میں دفعہ ۲۹۵۔بی شامل کی گئی جس کی رو سے "جان بوجھ کر قرآن یا قرآنی آیاتِ مقدسہ کی بے حرمتی کرنا یا نقصان پہنچانا جرم" قرار دیا گیا اور ارتکابِ جرم کرنے پر مجرم کے

الفاظ کا استعمال روکتا ہے، چنانچہ سیکولر لابی کے ساتھ قادیانی لابی بھی جمع ہو جاتی ہے اور عالمی برادری اُن کی پشت پر ہوتی ہے۔ یہ تکون میڈیا میں اپنا وزن رکھتی اور اس مہم کو منظم کر دیتی ہے۔ یہ چار پشت در پشت تائیدی عناصر (سیکولر، قادیانی، عالمی برادری اور میڈیا) لادین حلقوں کی اس جدوجہد میں انتہاپسندی، شدت اور دباؤ پیدا کر دیتے ہیں، جس کے سامنے حکومتِ وقت کو گھٹنے ٹیکے بنا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ان چار عناصر کو انتہاپسند مذہبی عنصر اور جرائم پیشہ عناصر کا غلط استعمال مزید تقویت دیتا ہے کہ اس قانون کو ختم کر دیا جائے۔ جبکہ اس قانون کی ضرورت اپنی جگہ مسلّمہ ہے، اور اس نظریاتی دہشت گردی کو ہم مسلمانوں کو جذبۂ ایمانی کے ساتھ روکنے کی جدوجہد کرنی چاہیے اور اس کے غلط استعمال کی حوصلہ شکنی اور روک تھام کرنی چاہیے۔ شریعتِ اسلامیہ میں بھی ان پیچیدگیوں کا یہ حل نہیں کہ یہ شرعی سزا سرے سے ختم کر دی جائے اور نہ ہی عام جرائم کے سلسلے میں یہ حل قطعاً مناسب ہے کہ جس قانون کا غلط استعمال ہو، اس کو کتابِ قانون سے ہی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے یا اس کو ناقابل استعمال بنا کر رکھ دیا جائے، بلکہ اس کے غلط استعمال کو روکنے کی سعی پیہم کی جائے۔

⑧ مذکورہ بالا دباؤ اور دو طرفہ انتہاپسندی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان میں آج تک توہین رسالت کے کسی مجرم کو سزا تو نہیں مل سکی، البتہ ممتاز حسین قادری کو سزائے موت دے کر، حکومتِ وقت نے اس قانون کا سہارا لینے والوں کو سبق ضرور سکھا دیا ہے اور اب 'مذہبی تشدد کے فروغ' کے الزام کی بنا پر اس قانون کی تائید کرنے والوں کو سہولت کار کے درجے میں ڈالا جانا باقی رہ گیا ہے۔ اس طرح حکومت مرتکبِ جرم شاتمان کو بیرونِ ملک روانہ کر کے اور ممتاز قادری کو سزائے موت دے کر، منصف کی بجائے فریق بننے کا تاثر گہرا ہے۔ جبکہ مسئلہ کا درست حل یہ ہے کہ اس قانون کے غلط استعمال کو روکا جائے، مذہبی انتہاپسندی کی روک تھام کی جائے اور اس لبرل انتہاپسندی کا بھی راستہ روکا جائے جو ہمارے عقیدہ وایمان سے کھیلنا چاہتی اور

لیے عمر قید کی سزا مقرر کی گئی۔ ۲۶/ اپریل ۱۹۸۴ء کو آرڈیننس ۲۰، ۱۹۸۴ء کے ذریعے دفعہ ۲۹۸۔بی کا اضافہ کیا گیا جس کی رو سے قادیانی یا لاہوری گروپ سے تعلق رکھنے والے احمدیوں کو خلفاے صحابہ کرام کے علاوہ کسی کو امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، صحابی یا رضی اللہ عنہ کہنے، اُمّ المومنینؓ کے سوا کسی کو یہ القاب دینے، اہل بیت کے سوا کسی اور کو اہل بیت کہنے اور اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کہنے، اور انہیں اپنی عبادت گاہ میں عبادت کیلئے بلاوے کو اذان قرار دینے کو جرم قرار دیدیا گیا جس کی سزا تین سال قید اور جرمانہ مقرر کر دی گئی۔ تعزیراتِ پاکستان میں دفعہ ۲۹۸ سی کا اضافہ کر کے احمدیوں کو اپنے آپ کو مسلمان، اپنے عقیدے کو اسلام کہنے اور اپنے عقیدے میں آنے کی دعوت دینے کی سزا تین سال قید اور جرمانہ مقرر کی گئی۔ عقائد میں واضح فرق کے اعتبار سے ایسا اس لئے ضروری تھا کہ کوئی اپنے غیر اسلامی عقائد کو اسلام میں گڈمڈ کر کے ابہام پیدا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

قلبِ مسلم سے اسم محمد ﷺ کو کھرچ دینا چاہتی ہے۔

⑨ حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ ایک طرف شتم رسول کے غلط الزامات کی روک تھام کی جائے تو دوسری طرف معاشرے میں پھیلی توہین رسالت کو بھی کنٹرول کیا جائے۔ بالفرض اسلام آباد کے بلاگر زیامثال خاں نے یہ جرم نہیں کیا، لیکن پاکستان میں ہونے والے اس جرم کے مرتکب کا کھوج نکالنا اور اس کو قرارِ واقعی سزا دینا بھی تو حکومت کا ہی کام ہے۔ ٹیکنالوجی کی پیچیدگیوں کا نام لے کر حکومت اور انتظامیہ، ان مسائل سے کب تک لاتعلقی برتتی رہے گی۔ چنانچہ اسلام آباد ہائی کورٹ کے فاضل جج جناب شوکت عزیز صدیقی کے یہ ریمارکس بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ "اگر سوشل میڈیا پر یہ اہانت کا سلسلہ روکا نہیں جاسکتا اور اس کے مجرموں کو قرارِ واقعی سزا نہیں دی جاسکتی، تو پھر ایسے ذرائع ابلاغ کو بند کر دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ہمارے دین وایمان کا تحفظ، کسی ابلاغی ذریعہ کی افادیت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔" اور یہی بات وفاقی وزیر داخلہ جناب چودھری نثار نے بھی کہی ہے کہ "ہمارا مذہب اور اس کے تقاضوں کا تحفظ ہر چیز سے پہلے ہے۔"

بایں وجہ حکومت صرف غلط استعمال کی دہائی دے کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی بلکہ اس کو اہانتی پوسٹس کے ذمہ داران کا سراغ جلد از جلد لگانا ہوگا اور ان کو قرار واقعی دینا ہوگی۔

مسئلہ کا حل

مسلمہ عقائد کو دباؤ کے ذریعے ختم یا مٹایا نہیں جاسکتا، بالخصوص نبی کریم ﷺ کا اہل اسلام سے جو تعلق ہمارے دین نے تشکیل دیا ہے، اس کے بارے میں بھولے سے بھی یہ سوچ لینا کہ دباؤ کے نتیجے میں مسلمان اس تعلق سے دستبرداری یا اس میں کمزوری کو قبول کرلیں گے، یہ بالکل ناممکن بلکہ خارج از خیال امر ہے جیسا کہ واقعات شاہد ہیں کہ ممتاز قادری کو سزائے موت دینے کے باوجود اس سلسلے میں قانون شکنی رک نہیں سکی۔

نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے طرزِ عمل سے بتایا کہ آپ نے مشرکین کو بتوں کے بارے میں تعلیمات دینے کے باوجود اُن کو سختی سے ختم نہیں کیا، بلکہ قیام مکہ کے دوران اسی بیت اللہ میں نمازیں پڑھیں جس میں سیکڑوں بت موجود تھے۔ آخر جب عقیدۂ توحید کھل کر ذہنوں میں راسخ ہوگیا، تب ان بتوں کو فتح مکہ کے موقع پر بیک جنبش گرادیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کو دباؤ سے کچلا یا ختم نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ قرآن کریم نے بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مقدسات مثلاً معبودان، مقدس کتب، مقدس مقامات اور شخصیات کے

احترام کی تلقین کی ہے اور اس احترام کو ہی دعوت کے فروغ کا وسیلہ بنایا ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (سورۃ الانعام:۱۰۸)

"(اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالی نہ دو۔ ورنہ یہ لوگ جہالت کی وجہ سے چڑ کر اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر انہیں اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو جو کچھ یہ کرتے رہے، اس کی انہیں وہ خبر دے دے گا۔"

اس آیت کی تفسیر میں حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"یہ سد ذریعہ کے اُصول پر مبنی ہے کہ اگر ایک درست کام، اس سے بھی زیادہ بڑی خرابی کا سبب بنتا ہو تو وہاں اس درست کام کا ترک راجح اور بہتر ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ نے فرمایا کہ "تم کسی کے ماں باپ کو گالی مت دو کہ اس طرح تم خود اپنے والدین کے لئے گالی کا سبب بن جاؤ گے۔" (صحیح مسلم)

چنانچہ توہین رسالت کی شرعی سزا سے دستبرداری ایک ناممکن امر ہے۔ اور دستبرداری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس قانون کو یوں معطل کر دیا جائے کہ یہ قابل عمل نہ رہے، اس بات کو بھی اہل اسلام گوارا نہیں کریں گے اور جب تک توہین رسالت معاشرے میں موجود ہے یا درآمد ہوتی ہے، اور اس کے ازالے کے لئے اگر حکومت اقدام نہیں کرے گی، تو لوگ قانون کو ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہوتے رہیں گے جس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔

کسی بھی معاشرے میں عدل وانصاف ہی اس کے راہِ راست پر کاربند ہونے کا واحد طریقہ کار ہے، اور جب بھی کوئی سیدھی راہ سے انحراف کرتا ہے، تو عدالت اپنے ٹھوس اقدامات اور فوری فیصلوں کے ذریعے اس کوتاہی کا سدباب کرتی اور ملزم کو قرارِ واقعی انصاف مہیا کرتی ہے۔ معاشرے میں سزاؤں کا یہ کردار اس حدیث نبوی سے پوری طرح واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَثَلُ القَائِمِ عَلَى حُدُودِ اللهِ وَالوَاقِعِ فِيهَا، كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهَمُوا عَلَى سَفِينَةٍ، فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلاَهَا وَبَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا، فَكَانَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ المَاءِ مَرُّوا عَلَى مَنْ فَوْقَهُمْ، فَقَالُوا: لَوْ أَنَّا خَرَقْنَا فِي نَصِيبِنَا خَرْقًا وَلَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَإِنْ يَتْرُكُوهُمْ وَمَا أَرَادُوا هَلَكُوا جَمِيعًا، وَإِنْ أَخَذُوا عَلَى أَيْدِيهِمْ نَجَوْا، وَنَجَّوْا جَمِيعًا»[1]

---

1 صحيح البخاري :كِتَابُ الشَّرِكَةِ، بَابٌ: هَلْ يُقْرَعُ فِي القِسْمَةِ وَالِاسْتِهَامِ فِيهِ: برقم ۲۴۹۳

"اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے اور اس میں گھس جانے والے (یعنی مخالفت کرنے والے) کی مثال ایسے لوگوں کی سی ہے جنہوں نے ایک کشتی کے سلسلے میں قرعہ ڈالا جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں کو کشتی کے اوپر کا حصہ اور بعض کو نیچے کا۔ پس جو لوگ نیچے والے تھے، انہیں (دریا سے) پانی لینے کے لیے اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اپنے ہی حصہ میں ایک سوراخ کر لیں تاکہ اوپر والوں کو ہم کوئی تکلیف نہ دیں۔ اب اگر اوپر والے، نیچے والوں کو من مانی کرنے دیں گے تو کشتی والے تمام ہلاک ہو جائیں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ لیں تو یہ خود بھی بچیں گے اور ساری کشتی بھی بچ جائے گی۔"

اس مثال میں نبی مکرم ﷺ نے جہاز کو معاشرے سے تشبیہ دیتے ہوئے، جہاز کے نچلے حصے میں سوراخ کرنے کو جرم کی مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ جس طرح دریا میں چلنے والا جہاز سوراخ کی بنا پر منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح مسلم معاشرہ جرائم کی موجودگی میں فلاح وصلاح کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ پھر جس طرح اس سوراخ کو بند کرنا جہاز کے ہر مسافر کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ ہلاکت سے بچ جائے، اسی طرح جرائم کی روک تھام کرنا، اللہ کی حدود کے قیام کے ذریعے جو معاشرے کی حیات کا ذریعہ ہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جو مسلمان فرد، اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرے گا، وہ پورے معاشرے کا مجرم ہے۔

چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس شریعت پر مبنی قانون پر پوری ایمانی بصیرت کے ساتھ کاربند رہا جائے، اس کے غلط استعمال کے دروازے بند کئے جائیں جیسا کہ اس کی بعض سفارشات پیچھے گزر چکی ہیں، جن کا مقصد قانون کو معطل کرنے کی بجائے اس کے غلط استعمال کی روک تھام ہے۔

اس قانون پر آنے والے مغربی دباؤ کو سمجھا جائے اور حکمت وبصیرت کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا جائے۔ اور اس پر اعتراض کرنے والوں کو شریعتِ اسلام اور عوامی آرا پر مبنی قانون کی توہین کا مرتکب بتایا جائے۔

معاشرے میں دَر آنے والی ہر بے راہ روی کا ازالہ مؤثر نظام عدل سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور نظام عدل ہی معاشرے کی جان ہوتا ہے۔ نظام عدل کو ہر دو جرائم (توہین رسالت اور قانون کو ہاتھ میں لینے) کے خاتمے کے لئے بیدار اور متحرک ہونا چاہیے اور بلا گرز یا مشال کیس کی طرح ماضی میں توہین رسالت کے ناجائز الزام کا نشانہ بننے والے حفاظِ کرام کے حق میں بھی متحرک ہونا چاہیے۔ ایسے حساس کیسز کو ترجیحی طور پر نمٹانا چاہیے اور ہر ہر کیس کی نوعیت کی مطابق ان میں عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں۔ اگر معاشرے میں یہی صورتحال جاری رہتی ہے تو یہ نظام عدل کی موت ہے جو آخر کار معاشرے کی موت پر منتج ہو گی۔ العیاذ باللہ

(ڈاکٹر حافظ حسن مدنی)

'قانون توہین رسالت کے غلط استعمال پر نظر ثانی'

مفتی محمد حان قادری

سینٹ کی قائمہ کمیٹی کے لئے جملہ مسالک کے علمائے کرام کی مشترکہ سفارشات

روزنامہ 'جنگ' کی اشاعت مؤرخہ ۱۳؍ جنوری ۲۰۱۷ء کی وساطت سے معلوم ہوا کہ سینٹ آف پاکستان کی 'قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق' قانونِ توہین رسالت کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے چوبیس سالہ پرانی تجاویز پر غور وفکر کرنے لگی ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ اس قانون کے تحت جھوٹے مقدمات کی روک تھام کے لیے غور وفکر کیا جائے اور اگر ضروری سمجھا جائے تو ضوابطی قوانین (Procedural laws) میں تبدیلیاں بھی لائی جائیں لیکن اس سے قبل یہ جائزہ ضرور لیا جائے کہ جھوٹے مدعیان سے نمٹنے کے لیے مروّجہ قوانین میں پہلے سے ہی گنجائش موجود ہے۔

'ضوابطی قوانین' پر نظر ثانی

اس ضمن میں مقدمے کے مختلف مراحل پر اس کے جھوٹا ثابت ہونے پر تعزیراتِ پاکستان کی دفعات ۱۸۲، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۰۳ اور ۲۱۱ کے تحت جھوٹے مدعی کے خلاف مناسب اور مؤثر کاروائی کی جاسکتی ہے۔ آپ بھی ان دفعات کا اچھی طرح جائزہ لے لیں۔ یہ بات بھی قائمہ کمیٹی کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سے قبل تفتیش کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ضوابطی قوانین میں پہلے بھی ترمیم کی جاچکی ہے جس کی رو سے ۲۹۵ سی کے تحت درج ہونے والی ایف آئی آر کی تفتیش سپرنٹینڈنٹ پولیس سے کم سطح کا آفیسر نہیں کرسکتا۔ اس ترمیم کے مثبت اثرات عیاں ہیں کیونکہ دورانِ تفتیش ملزمان کی کثیر تعداد کو بے گناہ قرار دیا گیا ہے اور بالعموم انہی ملزموں کے چالان عدالت میں بھجوائے جاتے ہیں جنہوں نے فی الواقع یہ جرم کیا ہوتا ہے۔

مزید بہتری لانے کے لیے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ توہین رسالت کے وقوعہ کے بعد جو بھی درخواست برائے اندراج مقدمہ متعلقہ تھانہ میں آئے تو ملزم کو پولیس بلاتردّد اپنی حفاظت میں لے لے لیکن ایف آئی آر کا اندراج نہ کرے اور معاملہ کی شرعی حیثیت کی جانچ کے لیے سرکاری سطح پر تمام مسالک کے جید علما پر مشتمل ایک مستقل بورڈ بنادیا جائے۔ متعلقہ تھانیدار پابند ہو کہ وہ یہ معاملہ اس بورڈ تک ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر پہنچا

دے۔ بورڈ سات یوم کے اندر اندر شرعی اعتبار سے معاملہ کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ واپس تھانے دار کو بھجوا دے۔ بورڈ اندراجِ مقدمہ کی سفارش کرے تو ملزم کے خلاف ایف آئی آر درج کرلی جائے ورنہ اسے باعزت طور پر چھوڑ دیا جائے۔ اس صورت میں جھوٹے مدعیان و گواہان کے خلاف تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۱۸۲ کے تحت کاروائی کی گنجائش پہلے ہی قانون میں موجود ہے۔ مجوزہ انتظام کو قانونی شکل دینے سے جھوٹے مقدمات پر قابو پانا یقینی اور سہل ہو سکتا ہے۔

'سزاے موت' پر نظر ثانی

آپ کے اخباری بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ سینیٹ پاکستان کی 'قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق' اس تجویز پر بھی غور کرے گی کہ ۲۹۵ سی کے تحت سزا کو کم کر کے سزاے موت کی بجائے عمر قید میں تبدیل کر دیا جائے۔

ہماری گزارش ہے کہ اس پر غور و فکر مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر سعی لاحاصل ثابت ہو گا:

① ۱۹۹۱ء تک ۲۹۵ سی میں متبادل 'سزاے عمر قید' کے الفاظ موجود تھے۔ طویل قانونی جدوجہد کے بعد بالآخر وفاقی شرعی عدالت نے عمر قید کی متبادل سزا کو غیر اسلامی قرار دیدیا اور حکومتِ پاکستان کو حکم دیا گیا کہ وہ ۳۰/ اپریل ۱۹۹۱ء تک عمر قید کی سزا کو ۲۹۵ سی کے متن میں سے حذف کر دے۔ حکومت نے ابتداءً اس فیصلے کے خلاف شریعت اپیل نمبر ۵ کے تحت پٹیشن نمبر ۱ کی رو سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپلیٹ بینچ میں اپیل دائر کر دی لیکن موجودہ وزیر اعظم میاں نواز شریف جو اس وقت بھی وزیر اعظم تھے اُنہوں نے یہ اپیل واپس لے لی۔

② اسی طرح دوسری اپیل وفاقی شرعی عدالت میں پٹیشن نمبر ۴۳/ ۱ آف ۱۹۹۳ کے تحت علامہ بشپ دانی ایل تسلیم نے دائر کی جس میں وفاقی شرعی عدالت کے مذکورہ بالا فیصلے کو اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا کہ یہ فیصلہ اسلام کے احکام کے منافی ہے۔ چنانچہ اسے جسٹس ڈاکٹر فدا محمد کی سربراہی میں فل بینچ نے سنا اور ۸ جنوری ۱۹۹۴ء کو اس پٹیشن کو بھی خارج کرنے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ علامہ بشپ دانی ایل تسلیم نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپلیٹ بینچ میں ۱۹۹۴ء میں اپیل نمبر ۲ دائر کی جسے فل کورٹ نے عدم پیروی کی بنیاد پر مؤرخہ ۲۱/ اپریل ۲۰۰۹ء کو خارج کر دیا اور یوں یہ معاملہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے ذریعے طے پا گیا کہ پاکستان میں نافذ العمل قانون ۲۹۵ سی کے تحت کتاب و سنت کی روشنی میں توہین رسالت کی سزا صرف اور صرف موت ہو گی۔

③ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان فیصلوں کے بعد بھی تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ سی میں سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف نہ کیے گئے جس پر فیڈرل شریعت کورٹ میں پٹیشن نمبر ۰۸/۰۱/۲۰۰۷ء اور ۰۹/۰۱/۲۰۱۰ء دائر کی گئیں جن میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے ۳۰/اپریل ۱۹۹۱ء کے فیصلے کے بعد تعزیراتِ پاکستان کی ۲۹۵ سی کے متن سے متبادل سزاے عمر قید کے الفاظ حذف کرنے کے احکام جاری کیے جائیں۔ چنانچہ مؤرخہ ۴/اکتوبر ۲۰۱۳ء کو وفاقی حکومت نے سیکرٹری لاء، جسٹس اینڈ ہیومین رائٹس کے ذریعے ایک رپورٹ عدالت میں جمع کروائی جس میں یہ واضح کیا گیا کہ اگست ۱۹۹۱ء میں سینیٹ میں ایک بل پیش کیا گیا تھا جس کے ذریعے ۲۹۵ سی تعزیراتِ پاکستان میں سے عمر قید کی سزا کے الفاظ حذف کرنے کی بات کی گئی تھی۔ سینیٹ نے یہ بل منظور کر لیا تھا اور پھر اسے قومی اسمبلی کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن قومی اسمبلی نے اسے ۹۰ دن کے اندر منظور نہ کیا۔ اس کے باوجود آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۰۳ د کی دفعہ ۳ کے پیراگراف (ط) کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر ۲۹۵ سی سے سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کرنے کی حد تک عمل درآمد ہو چکا ہے۔

عدالت نے اپیل کنندہ کے وکیل کو بھی سنا اور اس کے بعد سیکرٹری منسٹری آف لاء، جسٹس اور ہیومین رائٹس کو ہدایت جاری کی کہ وہ زیر بحث فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے ضروری اقدام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ سزائے عمر قید کے الفاظ ۲۹۵ سی تعزیراتِ پاکستان کے متن سے حذف کر دیئے جائیں اور تمام ہائی کورٹس کے رجسٹرار حضرات کو ہدایت کی جائے کہ وہ اسے تمام جوڈیشل آفیسرز تک پہنچا دیں۔ یہ فیصلہ ۴/دسمبر ۲۰۱۳ء کو سنایا گیا اور پی ایل ڈی ۲۰۱۴ء، شریعت کورٹ ۱۸ کے تحت وایلم L.xvi کے صفحات ۱۸ تا ۲۳ پر درج ہے۔ قدرے تفصیل کے ساتھ اس قانون کی تاریخ قلم بند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو واضح ہو جائے کہ ۲۹۵ سی میں سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کروانے کے لیے کن کن مراحل سے گزرا گیا۔ اب اگر قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق دوبارہ اسی سزا پر غور کرتی ہے جسے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت اور خود سینٹ جیسے ادارے نے بھی مسترد کرتے ہوئے ۲۹۵ سی میں سے سزائے عمر قید کو حذف کرنے کا فیصلہ دیا ہوا ہے تو یہ نہ صرف سعی لاحاصل ہو گی بلکہ یہ ایک طرح سے ہمارے ہاں ہونے والی قانون سازی کے عمل کا مذاق اُڑانے کے مترادف بھی ہو گا۔

④ توہین رسالت کی شرعی سزا صرف اور صرف موت ہے، اس پر قرآن حکیم کی درجنوں نصوص، احادیث مبارکہ اور خود حضور ﷺ کے متعدد فیصلے شاہد ہیں جن کا احاطہ تفصیل کے ساتھ وفاقی شرعی عدالت نے

اپنے ۱۹۹۱ء کے فیصلے میں کر دیا ہے۔ اسی سزا پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا تعامل رہا اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ نے اسے اختیار کیا، بلکہ اہل علم نے اسی پر اُمت کا اجماع نقل کیا ہے۔

⑤ یہ نازک اور حساس معاملہ ہے جس کا براہ راست تعلق اُمت کے جذبات کے ساتھ ہے۔ ماضی میں اس قانون کو ختم کرانے کے حوالے سے جو بھی کوششیں کی گئیں وہ کامیاب تو نہ ہو سکیں لیکن ملک میں امن وامان ختم کرنے اور فساد پھیلانے کا سبب ضرور بنیں۔

اندریں حالات ملی مجلس شرعی کے علما آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ Substantive law یعنی ۲۹۵ سی میں کسی قسم کی ترمیم خصوصاً اس کی سزا کم تر کرنا شرعی، قانونی اور آئینی طور پر ایک درست اقدام نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اس سے ملک کا امن وامان ایک دفعہ پھر خراب ہو جائے گا۔ ویسے بھی جھوٹے مقدموں کا خاتمہ Procedural laws یعنی ضوابطی قوانین میں بہتری لانے سے تو ہو سکتا ہے لیکن سزا کی کمی بیشی سے نہیں اور نہ ہی جھوٹے مقدمات کا تعلق سزا کی مقدار اور Substantive law سے بنتا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ علمائے کرام کی ان گزارشات کا بغور جائزہ لیں گے اور یہ صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوں گی۔ اگر اس مسئلہ میں قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق کو مجلس کے علمائے کرام کی معاونت درکار ہو تو ہمیں یہ خدمت سرانجام دے کر خوشی ہوگی۔

مفتی محمد خان قادری (صدر ملی مجلس شرعی پاکستان) و دیگر علما اراکین مجلس

بخدمت محترم سینیٹر فرحت اللہ بابر صاحب، سینٹ پاکستان، اسلام آباد

کاپی برائے اطلاع: چیئرمین سینیٹ و دیگر

اراکین قائمہ کمیٹی برائے ہیومین رائٹس

پاکستان شریعت کونسل کے اجلاس میں علمائے کرام اور مولانا زاہد الراشدی کا اظہارِ خیال

"توہین رسالت سنگین ترین جرم ہے مگر کسی پر توہین رسالت کا الزام لگا کر اور تحقیق کے بغیر کارروائی کرنا بھی اسی طرح سنگین ترین جرم ہے۔ مردان واقعے کی ذمہ داری حکومتی طرزِ عمل اور یونیورسٹی انتظامیہ کی لاپرواہی پر عائد ہوتی ہے۔ سپریم کورٹ کا از خود نوٹس بروقت ہے۔ حقائق جلد از جلد منظر عام پر لائے جائیں۔ حکومت توہین رسالت قانون پر عمل درآمد یقینی بنائے اور ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے مزید قانون سازی کرے۔ علمائے کرام اور دینی اداروں کے کردار کو محدود کیا جائے گا تو پھر اس کے یہی نتائج نکلیں گے۔ علمائے کرام لوگوں میں شعور اُجاگر کرنے کیساتھ ساتھ قوم کی صحیح سمت رہنمائی بھی کریں۔

فروغِ اسلام کے لیے افرادی تعاون

محمد نعمان فاروقی

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسند فرمودہ دین ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بیش قیمت تعلیمات وتفصیلات اور ہمہ نوعیت کی خوبیاں موجود ہیں۔ یہ اسلام اپنی اتم اور اکمل صورت میں قرآن وسنت میں محفوظ ہے۔ تاہم اس کی یہ عظمتیں اس امر کی کامل ضمانت نہیں کہ واقعتاً یہ عظیم دین لوگوں کی اکثریت کو قبول بھی ہو۔ آج دنیا بھر میں اسی عظیم دین اور اس کو لانے والے پیغمبر ﷺ... جو حقیقی معنوں میں محسن انسانیت ہیں ...کے بارے میں درجنوں اعتراضات اور شبہات لوگوں کے ذہنوں میں ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، حتی کہ فی زمانہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو کائنات کی مظلوم ترین ہستی بنادیا گیا ہے۔

چنانچہ کسی شے کا حق ہونا ایک حقیقت ہے لیکن لوگوں کا اس حق کو پہچاننا اور قبول کرنا چیزے دیگر ہے۔ لازمی نہیں کہ ہر حق دنیا میں اپنے حقوق کو حاصل بھی کرلے، بلکہ باطل قوتیں اپنی تدبیر وسازش کے سہارے حق کے چہرے کو دھندلا کرنے اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی جہد وسعی کرتی رہتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اسلام کے حق ہونے پر اکتفانہ کیا بلکہ اپنی دعوت کو پھیلانے کے لئے ہر طرح کی کوششیں بروئے کار لائے۔ دعوتِ اسلام کے فروغ میں جس طرح صداقت وامانت، حکمت وبصیرت، خدمت واخلاق، مؤثر عقلی ومنطقی ابلاغ، خوبصورت پیرایۂ بیان، عزیز وقرابت داری، بے پناہ جدوجہد، اصلاح کی ہر ممکنہ فکر اور اس کی تدبیر کے ہر پہلو کو نبی کریم ﷺ نے اختیار کیا، اسی طرح آپ ﷺ نے اس عظیم دعوت کے فروغ اور اس کی قبولیت کو عام کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں کا بھی سہارا لیا، اپنے پیغام کو پھیلانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی ساتھیوں کی مدد مانگی، اور خود بھی فروغِ دعوت کے لئے سازگار ماحول حاصل کرنے کی غرض سے صلحیں ،معاہدے اور نکاح تک کئے۔ سابقہ شریعتوں میں اس انسانی مدد اور تائید کی مثال سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا سے ہوتی ہے جس میں اُنہوں نے فرعون کے سامنے دعوتِ اسلام کے لئے اپنے بھائی ہارون کا ساتھ مانگا، پھر ربّ ذوالجلال کے حضور ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝﴾ (سورۃ طٰہٰ:۲۹تا۳۲) کی دعا کی۔ آیئے ہم پیارے نبی محمد ﷺ کی سیرت سے مطالعہ کرتے ہیں کہ

آپ نے اپنی دعوت کے فروغ میں کس طرح انسانی تائید کے ذریعے اسلام کو سربلند اور دعوت کو فروغ دیا۔ یہ وہ نبوی تدبیر ہے جسے آج دعوت کا کام کرنے والوں کو محض اس اعتماد پر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ خلوص کے ساتھ حق کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ کی مدد اُنہیں از خود حاصل ہو جائے گی۔ ح م

فروغِ اسلام کے لیے نبی کریم ﷺ نے ہر ممکن کوشش کی۔ ہر پہلو سے اسلام کی تائید اور نصرت کی۔ اس دور میں رائج میڈیا کا سہارا لیا اور وسائل استعمال کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے لوگوں کے ذریعے بھی دین اسلام کو فروغ دیا۔ اہل ایمان تو ایک عظیم جذبے کے تحت اس مشن میں آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے ہی مگر نبی ﷺ نے ایسی حکمتِ عملی اپنائی کہ متعدد معاہدے، سفارتی تعلقات اور مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے اغیار سے بھی یہ کام لیا اور اُنہیں اسلام کی دعوت پہنچائی اور ابرِ رسالت و رحمت کے سائے میں لانے کی جستجو کی۔

غیر مسلموں سے تعاون لینے کی شرعی حیثیت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم (ایک جنگ کے سفر پر) تھے۔ آپ ﷺ نے اسلام کے دعویدار ایک شخص کے بارے میں فرمایا: «هٰذَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ» "یہ جہنمیوں میں سے ہے۔"

جنگ کا آغاز ہوا تو اس شخص نے کفار کے مقابلے میں بہادری کے خوب جوہر دکھائے اور بالآخر وہ زخمی ہو گیا۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ یہ جہنمی ہے مگر وہ تو آج کفار کے خلاف بڑی جواں مردی سے لڑا ہے اور اب وہ فوت بھی ہو چکا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "آگ کی طرف ہی گیا ہے۔"

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگ شک میں گرفتار ہونے کو تھے اور ابھی انہی چہ مگوئیوں میں مگن تھے کہ یہ خبر آئی کہ وہ خود فوت نہیں ہوا بلکہ وہ شدید زخمی حالت میں تھا، پھر گزشتہ رات اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا تو اس نے خودکشی کر لی تھی۔ نبی ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا: «اللهُ أَكْبَرُ أَشْهَدُ أَنِّي عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهُ»

"اللہ سب سے بڑا ہے! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"

پھر آپ ﷺ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے ذریعے یہ اعلان عام جاری فرمایا:

«إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا نَفْسٌ مُسْلِمَةٌ، وَإِنَّ اللهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ»[1]

"بے شک جنت میں صرف مسلمان ہی جائے گا اور بے شک اللہ تعالیٰ فاجر آدمی کے ذریعے بھی اس دین کی تائید کر دیتا ہے۔"

---

1 صحیح بخاری: ۳۰۶۲

مذکورہ حدیثِ مبارکہ اس موضوع پر اساسی حیثیت رکھتی ہے کہ دین کی ترویج و اشاعت اور نصرت و حمایت کے لیے گناہ گار حتیٰ کہ غیر مسلم سے بھی مدد لینے پر اللہ قادر ہے۔

ایک دوسری حدیث اس حدیث سے بظاہر متعارض بھی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک مشرک مگر کڑیل نوجوان نبی ﷺ کی معیت میں جنگ کرنے کے لیے اجازت طلب کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِرْجِعْ إِنَّا لَا نَسْتَعِيْنُ بِمُشْرِكٍ» [1]

"واپس چلے جاؤ بے شک ہم مشرک سے تعاون نہیں لیا کرتے۔"

ان دونوں روایات میں تطبیق کی صورت یہ نظر آتی ہے کہ پہلا شخص شرعی طور پر مسلمان تھا جیسا کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں: «يَدَّعِي الإِسْلَامَ» اور دوسری صورت واضح مشرک کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ خاص جنگ کی بات ہے، جبکہ سابقہ حدیث کا پس منظر اگرچہ خاص ہے مگر جو قاعدہ آپ ﷺ نے بیان فرمایا، وہ عمومی ہے کیونکہ جہاد اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہوتا ہے اور ایسا مشرک یا کافر سے ممکن نہیں۔ تیسری بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کافر یا فاجر سے چاہے تو دین کی نصرت کا کام لے لے مگر حکام کو اس سے بچنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کس سے کس طرح دین کی تائید کرا سکتا ہے، چنانچہ حدیث میں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو فاجر آدمی کے ذریعے بھی تقویت و تائید دے دیتا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس متعلقہ صلاحیت کے افراد موجود ہوں یا وسائل کی دستیابی ہو تو اغیار سے تعاون نہیں لینا چاہیے مگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو اسی صورت میں اغیار سے تعاون لیا جا سکتا ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے جب سفر ہجرت کیا تو آپ ﷺ کا گائیڈ ایک مشرک عبد اللہ بن اُریقط تھا۔ اس ضمنی بحث کے بعد اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سیرتِ مبارکہ کے وہ کون کون سے مواقع ہیں جہاں آپ ﷺ نے لوگوں کے تعاون کے ساتھ دعوتِ اسلام کو فروغ دیا۔ دعوت کے اس پہلو کی متعدد نوعیتیں تھیں:

۱۔ انفرادی طور پر دین کی تائید و نصرت

۲۔ معاہدوں اور حلفوں کی صورت میں فروغِ اسلام

۳۔ بین الاقوامی سطح پر ترویج اسلام

---

۱ سنن ابو داؤد: ۲۷۳۴

۴۔ مختلف قبائل میں نکاح کرکے اسلام کا فروغ

ذیل میں مذکورہ بالا اقسام کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ انفرادی طور پر دین کی تائید و نصرت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [1]

"وہ اللہ ہے جس نے اپنی نصرت اور مؤمنوں (کی حمایت) سے آپ کی تائید کی۔"

یہ صورت کیا تھی جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا؟ وہ یہی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے مشن میں آپ کے ہم رکاب ہوگئے۔ ان تائید کنندگان میں کچھ نام بہت نمایاں تھے۔ اور وہ تھے سیدنا ابو بکر صدیق، سیدنا عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم۔ اگرچہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار بھی بہت اعلیٰ اور قابل قدر تھا۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ: قبولِ اسلام کے بعد ہر سطح پر اسلام کے محافظ اور حامی ہونا ہی ان کی پہچان بنا۔ وہ ۲۳ سالہ عہدِ نبوت میں نبی کریم ﷺ کی معیت میں نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے نبوی مشن کو آپ ﷺ کے بعد بھی اپنے صحیح منہج پر قائم و دائم رکھا۔ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی انہی شبانہ روز محنتوں اور کٹھن حالات میں معیتوں کا اعتراف ان الفاظ سے کیا:

« إِنَّ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهِ وَمَالِهِ أَبُو بَكْرٍ » [2]

"سب لوگوں سے بڑھ کر اپنی رفاقت دینے اور مال نچھاور کرنے کا احسان ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔"

یہ رفاقت تو وہ تھی جو پُر خطر راہوں میں بھی نہ چھوٹی۔ یہ رفاقت اور درہموں کی نچھاوری نبی کریم ﷺ کی ذات تک محدود نہ تھی۔ ویسے بھی آپ ﷺ کو ذاتی طور پر درہم و دینار کی ضرورت نہ تھی۔ یہ سب کچھ تو اسلام کی ترویج کے لیے تھا۔

سیدنا عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کو مشرکین کی سخت ترین اذیت رسانی کے بارے میں بتایئے! وہ کہنے لگے: میں نے دیکھا کہ عقبہ بن ابی معیط نبی ﷺ کی طرف بڑھا، آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ نے چادر آپ ﷺ کے گلے میں ڈالی اور اسے زور

---

۱ سورۃ الانفال: ۶۲

۲ صحیح بخاری: ۴۶۶

سے بل دینے شروع کر دیے۔ اتنے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے تو اُنہوں نے اس بد بخت کو پیچھے ہٹایا اور کہنے لگے:

﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾[1]

"کیا تم اس عظیم شخص کے درپے ہو جو کہتے ہیں کہ میرا ربّ اللہ ہے، اور تحقیق وہ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے روشن دلائل بھی لائے ہیں۔"

اسلام کے ہر اول دستے کے خمسہ مبشرہ افراد سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر دامن اسلام سے وابستہ ہوئے تھے جن کے نام یہ ہیں: سیدنا عثمان، سیدنا زبیر، سیدنا عبد الرحمٰن بن عوف، سیّدنا سعد بن ابی وقاص اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہم۔ دراصل سیدنا ابو بکرؓ بلند اخلاق کے مالک تھے اور ان کے سماجی اور تجارتی تعلقات کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُنہیں اپنے ملنے جلنے والوں میں دعوت پھیلانے کا خوب موقع میسر آیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متعدد قبائل میں جا کر اسلام کی دعوت دیتے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ مشن رسالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ علم انساب کے ماہر تھے۔ اس طرح قبائل کو دعوت دینے کے لیے راہ ورسم بڑھتے اور دعوت کے لیے ساز گار ماحول بن جاتا۔

مصادرِ سیرت میں قبائل کو دعوت دینے کا اُسلوب یہ نظر آتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ہوتے۔ پہلے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ متعلقہ قبیلے کی معلومات کا تبادلہ کرتے۔ جب اہل قبیلہ ذہنی طور پر بات سننے کو تیار ہو جاتے تب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت بڑے اطمینان اور تسلی سے دیتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ صفحاتِ سیرت میں محفوظ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قبیلہ بنو شیبان کو دعوت دینے کے لیے تشریف لے گئے تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ آپ کے رفیق تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی ایک پروقار مجلس میں پہنچے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سلام کیا اور ان سے قبیلے کا تعارف پوچھا کہ آپ کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ وہ کہنے لگے: ہم بنو شیبان بن ثعلبہ سے ہیں۔

اب ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر عرض پرداز ہوئے: میرے ماں باپ آپ پر قربان! ان زعمائے قوم کے بعد اس قوم کا اکرام باقی نہیں رہے گا۔ اس وقت ان میں مفروق بن عمرو، ہانی بن قبیصہ، مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور نعمان بن شریک موجود تھے جبکہ مفروق سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مفروق کے بالوں کے دو لٹیں اس کے سینے پر پڑ رہی تھیں۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تمہارے افرادِ قبیلہ کی تعداد

---

[1] صحیح بخاری: ۳۶۷۸

کتنی ہے؟ وہ بولا: ہم ایک ہزار سے اوپر ہیں جبکہ ایک ہزار کو بھی قلت کے باعث مغلوب نہیں کیا جاسکتا....

قبیلے کے بارے میں سوال وجواب جاری تھے کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ یکبارگی کہنے لگے: اگر آپ تک رسول اللہ ﷺ کے بارے میں معلومات پہنچی ہیں تو یہ ہیں اللہ کے رسول ﷺ!! مفروق کہنے لگا: ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر مفروق نبی ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: قریشی بھائی! آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ نبی ﷺ آگے بڑھے: تشریف فرما ہوئے اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چادر سے آپ پر سایہ کیا، پھر نبی ﷺ فرمانے لگے:

«أَدْعُوْكُمْ إِلٰى شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللهِ ...» [1]

"میں تمہیں اس گواہی کی دعوت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔"

جناب ابو طالب: نبی کریم ﷺ کے چچا ابو طالب سے بھی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی نصرت وحمایت اور ناموس ودفاع کا بڑا کام لیا۔ اُصول وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس سے چاہے اس دین کو تقویت دے۔ آغازِ دعوت میں تو مشکلات نہیں تھیں۔ خاموش دعوت گنی چنی سعادت مند روحوں کے قلب میں گھر کر چکی تھی۔ معبودانِ باطلہ کی تردید میں وہ زور بھی نہیں تھا مگر جب یہ دعوت اپنے فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی اور اس کی کرنیں ہر ایک قلب ونظر کو متاثر کرنے لگیں اور کفارِ قریش کو اپنی سیادت خطرے میں نظر آنے لگی تو پھر وہ مقابلے میں اُترے اور ہر ممکن اور غیر ممکن طریقے سے دعوت کو دبانے کی لاحاصل جستجو میں لگ گئے۔ مگر وہ سماجی، سیاسی یا مذہبی جس راستے سے بھی آئے، ان کے سامنے جناب ابو طالب مضبوط ڈھال ثابت ہوئے۔ شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا ہو یا سماجی بوجھ ڈال ڈال کر مجبور کرنے کی کوشش ہو، ہر پہلو سے اُنہوں نے آزمایا لیکن ابو طالب اپنے بھتیجے کی نصرت وحمایت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے۔

ابن اسحٰق رحمہ اللہ کہتے ہیں: "جب ابو طالب رخصت ہوئے تو قریش رسول اللہ ﷺ کو ایسی اذیتیں پہنچانے لگے جو ان کی زندگی میں ممکن نہ تھیں۔" [2]

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ایک سوال تھا جس کا اظہار اُنہوں نے نبی ﷺ سے کیا کہ ابو طالب آپ کی حفاظت اور نگہبانی بھی کرتے تھے، آپ کی نصرت وحمایت بھی کرتے تھے (اور آپ کے لیے دوسروں سے ناراض بھی ہوتے تھے) تو کیا اُنہیں ان خدمات کا فائدہ ہوگا؟ فرمایا:

---

۱ دلائل النبوۃ: ۱/ ۲۵۰

۲ السیرۃ النبویۃ از ابن ہشام: ۲/ ۲۶۶

«نَعَمْ هُوَ فِي ضَحْضَاحٍ مِنْ نَّارٍ وَلَو لَا أَنَا لَكَانَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ»[1]

"ہاں! ان کے ٹخنوں تک آگ ہو گی اور اگر میرے ساتھ ان کا یہ رویہ نہ ہوتا تو پھر وہ آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوتے۔"

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ دعوت کی ترویج واشاعت میں جناب ابو طالب کا نمایاں کردار ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ: حالات کی سنگینی بڑھتی جا رہی تھی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ اسلام کو عزت، عروج اور غلبے کے لیے کسی نابغہ روزگار جری و بہادر اور نڈر عبقری شخصیت کی ضرورت تھی۔ نگاہِ نبوت نے اس ضرورت کے لیے دو افراد کو منتخب کیا اور اللہ سے دعا مانگی:

«اللّٰهُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ إِلَيْكَ بِأَبِي جَهْلٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنَ الْخَطَّابَ»[2]

"الٰہی! ابو جہل یا عمر بن خطاب میں سے جو تجھے پسند ہے، اسکے ذریعے اسلام کو عزت سے ہم کنار کر۔"

اور اللہ تعالیٰ کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پسند تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد دعوتِ اسلام کو تو گویا پر لگ گئے اور دعوت پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے پھیلنے لگی اور عزت میں اضافہ ہوا۔ اس عزت اور وقار کا جائزہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ جب سیدنا عمر شہادت سے سرفراز ہوئے تو روم و فارس کے تمام علاقے اسلام کے قلعے اور یہاں کے اکثر باسی حلقہ بگوش اسلام تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے درست فرمایا تھا:

"مَا زِلْنَا أَعِزَّةً مُنْذُ أَسْلَمَ عُمَرُ"[3]

"جب سے عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے، ہماری عزت و قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔"

سیدنا علی رضی اللہ عنہ: جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وجہ سے اسلام کو تقویت و تائید ملی، ان میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نام بھی بڑا نمایاں ہے۔ کوئی اہم معرکہ ہو یا مہم جوئی ہو، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ میں درخشندہ و تابندہ نظر آتے ہیں۔ عرصۂ جنگ ہے، یہودِ خیبر کو حجت پوری کرنے کے لیے دعوت کا آخری پیغام دینا ہے۔ زبانِ نبوت سے رات ہی کا اعلان ہو چکا ہے:

«لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُفْتَحُ عَلٰى يَدَيْهِ يُحِبُّ اللهُ وَرَسُوْلَهُ، وَيُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُوْلُهُ»

"صبح یہ عَلَم اس شخصیت کو دوں گا جس کے ہاتھ پر فتح ہو گی۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت

---

۱ صحیح مسلم: ۵۳۱، ۵۳۲

۲ جامع ترمذی: ۳۶۸۱

۳ صحیح بخاری: ۳۶۸۴

کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ان سے محبت کرتے ہیں۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ سوچتے ہوئے رات گزاری کہ ان میں سے کسے یہ اعزاز نصیب ہو گا۔ صبح ہوئی تو ہر ایک صحابی اس کی امید لگائے ہوئے تھے۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا: «أين علي» "علی رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟" عرض کیا گیا: "انہیں آشوبِ چشم ہے۔" نبی ﷺ نے اپنا لعابِ دہن اُن کی آنکھوں کو لگایا اور ان کے لیے دعا کی تو وہ بالکل تندرست ہو گئے، گویا تکلیف تھی ہی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے جھنڈا اُنہیں تھما دیا تو وہ کہنے لگے:

"میں ان سے قتال کروں گا۔ یہاں تک کہ وہ ہماری طرح (مسلمان) ہو جائیں۔" فرمایا:

"خراماں خراماں چلتے رہو! یہاں تک کہ جب تم ان کے درمیان پہنچ جاؤ تو اُنہیں اسلام کی دعوت دینا اور ان پر جو واجب ہے، وہ انہیں بتانا۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے سے ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے قیمتی سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔"[1]

ایک بے نام صحابیہ: کوئی محقق جب دعوتِ اسلام کی تائید وحمایت کے عنوان پر قلم اُٹھائے تو بھلا اس خاتون کو کیسے بھول سکتا ہے جسے ایک سفر میں پانی کے دو مشکیزوں سمیت نبی ﷺ کی خدمت میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ پانی کی بسیار تلاش کے باوجود بس یہی مشکیزے نظر آئے تھے۔ آپ ﷺ نے خاتون سے اجازت لے کر برتن طلب کیا اور مشکیزوں کا پانی اس میں اُنڈیلا اور لوگوں میں اعلان کروا دیا، پانی پیو اور جانوروں کو بھی پلاؤ۔ وہ خاتون پاس کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ صحابہ کہتے ہیں: ہم پی پلا کر فارغ ہوئے تو ہمارے خیال کے مطابق وہ مشکیزے پہلے سے بھی زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «اِجْمَعُوْا لَـهَا» "اس کے لیے اپنی طرف سے ہدایا اکٹھے کرو۔"

اُنہوں نے اکٹھے کیے اور چادر میں باندھ کر اس کے حوالے کر دیے۔ وہ خاتون جب اپنے علاقے میں پہنچی تو اُنہوں نے تاخیر کی وجہ پوچھی، اس نے سارا قصہ سنایا اور تبصرے کے طور پر کہنے لگی کہ "یا تو یہ سب سے بڑے جادوگر ہیں (نعوذ باللہ) یا پھر اللہ کے رسول ہیں۔" بعد ازاں جب مسلمان کوئی مہم جوئی کرتے تو آس پاس کے مشرکوں سے تو معرکہ آرائی کرتے مگر جس قبیلے کی وہ خاتون تھی، اس سے کنارہ کشی کرتے۔

پھر ایک دن وہی خاتون اپنے قبیلے کے افراد کو ان الفاظ سے دعوت دینے لگی: "میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ مسلمان لوگ عمداً تم سے کنارہ کشی کر رہے ہیں۔ کیا تم بھی اسلام میں رغبت رکھتے ہو؟"

---

1 صحیح بخاری: ۳۰۰۹

اس خاتون کو نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی کے چند ہی لمحے میسر آئے تھے۔ مگر اس کی اس دعوت پر اس کی زندگی بدل گئی اور وہ اپنی قوم کے قبولِ اسلام کا باعث بن گئی۔ اور وہ سب مسلمان ہو گئے۔[1]

قبیلہ ہمدان کی ایک سعادت مند روح: نبی کریم ﷺ مزدلفہ میں لوگوں کے بھرے مجمع میں اعلان فرمایا کرتے تھے: «أَلَا رَجُلٌ يَحْمِلُنِي إِلَى قَوْمِهِ؟ فَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُونِي أَنْ أُبَلِّغَ كَلَامَ رَبِّي»

"ہے کوئی شخص! جو مجھے اپنی قوم میں لے جائے تاکہ میں انہیں ربّ کا پیغام پہنچا سکوں کیونکہ قریش نے تو ربّ کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے۔"

خیر خواہی کے جذبے سے سرشار اور ہمدردی سے بھرپور اس آواز پر لوگ تیار تو ہو جاتے مگر سماجی پابندیاں رکاوٹ تھیں۔ اس صدائے دلنواز کا مثبت جواب دینے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ شخص بھی اپنی قوم کے زیر عتاب آجاتا۔ یہ صدائے نبوت بول بول کر بتا رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تبلیغ رسالت کے لیے ان تھک کوشش کی اور اپنے اَعوان وانصار تلاش کیے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ اب تک آپ ﷺ کے حامی اور جاں نثار موجود نہ تھے بلکہ آپ ﷺ قطعہ ارضی کے گوشے گوشے میں دعوت پھیلانا چاہتے تھے۔ یہ آوازِ دل نواز، جو اتنی صدیوں بعد بھی اپنے اندر اخلاص، ہمدردی اور احساسِ ذمہ داری لیے ہوئے ہے، لگتی رہی اور آخر ہمدان کا ایک شخص خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تمہارا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ اس نے بتایا: ہمدان سے۔

فرمایا: کیا تم دفاع کر پاؤ گے، عرض کیا: جی ہاں۔ مگر بعد میں اس شخص نے اپنی قوم سے خدشہ محسوس کیا کہ میری قوم مجھے بھی پناہ دینے سے انکار نہ کر دے۔ آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اجازت چاہی۔ میں قوم کے پاس جاتا ہوں، پھر اگلے سال آپ سے ملوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے (مدینہ کے) انصار کی شکل میں آپ کو دین کے 'انصار' عطا فرما دیے۔[2]

اس واقعے سے قریش کی ہٹ دھرمی بھی واضح ہوتی ہے کہ خود تو وہ دعوت سننے کے لیے تیار نہیں تھے مگر دوسرے قبائل کو بھی دعوت دینے کی سماجی پابندی لگا رکھی تھی۔

یہ چند ایک مثالیں تھیں جو دعوت کے انفرادی تعاون اور طرف داری کی آئینہ دار ہیں۔

---

۱ صحیح بخاری: ۳۴۴۴

۲ المعجم الاوسط: ۶۸۴۷

۲۔ معاہدوں کی صورت میں فروغِ اسلام

رسولِ اکرم ﷺ نے کئی ایک قوموں اور مذاہب سے معاہدے بھی کیے۔ وہ معاہدے دراصل اسلام کے فروغ کا پیش خیمہ تھے۔ اگر مدینہ منورہ جاتے ہی کسی عہد معاہدے کے بغیر دعوت اور اس کی ترویج و تنفیذ کا کام شروع ہو جاتا تو عین ممکن تھا، یہود اسے ہی حرفِ نزاع بنا لیتے۔ اس لیے آپ ﷺ نے تمام اقوام و مذاہب سے میثاقاتِ مدینہ کے طور پر کئی معاہدے کیے۔ اس سے مسلمانوں کو ببانگِ دہل اظہارِ رائے کا موقع ملا۔ مکہ مکرمہ میں ہزار رکاوٹوں کے باوجود دعوت اپنے زور پر پھیل رہی تھی۔ مدینہ میں پیش آمدہ رکاوٹیں اور خدشات ان معاہدوں میں دَب گئیں۔ اب تو دعوت کو پھلنے، پھیلنے اور پنپنے کا خوب موقع ملا، دعوت اپنے جوبن کو پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر گھر اور گھروندے سے صدائے لا الہ الا اللہ بلند ہونے لگی۔

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ یا معاہدۂ حدیبیہ بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس میں طے کی جانے والی شرائط اگرچہ ظاہراً مسلمانوں کے حق میں نہیں تھیں مگر وحی کی روشنی میں اس کے دور رَس نتائج نظر آ رہے تھے۔ صلح حدیبیہ مشرکین مکہ کے ساتھ ایک معاہدہ تھا مگر دعوتی سرگرمیوں کے لیے یہ ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ صلح حدیبیہ ۵ ہجری میں ہوئی۔ اس وقت حدیبیہ کے موقع پر موجود جاں نثاروں کی تعداد، اللہ ان سے راضی ہو، ۱۴۰۰ تھی مگر جب ۸ ہجری میں اس صلح کو قریش نے مسلمانوں کے حلیف بنو بکر پر حملہ کر کے توڑا، جب اس عہد شکنی پر قریش کے خلاف فتح مکہ کی پیش قدمی ہوئی تو اس وقت ان وفاشعاروں رضی اللہ عنہم کی تعداد دس ہزار سے متجاوز تھی۔ ان نفوسِ قدسیہ کی اکثریت اسی صلح حدیبیہ کے بعد دامن اسلام سے وابستہ ہوئی۔

دعوتِ اسلام تو وہ پودا ہے جسے ہر حال میں ثمر آور ہونا ہے۔ ہاں کسی زرخیز زمین اور مناسب ماحول میں یہ جلدی ثمر آور ہو جاتا ہے اور کبھی کچھ دیر کے بعد۔ غیر مسلموں سے عہد و معاہدے دعوتِ دین کے لیے مناسب ماحول مہیا کرتے ہیں۔

معاہدوں کی طرح حلف بھی دعوت کے لیے سود مند ثابت ہوئے۔ حلف داری میں رفاقت اور قربت ملتی ہے۔ ایک دوسرے کے مزاج، نفسیات، معمولات اور رسوم و رواج جاننے کا موقع ملتا ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے حلیف بننے کے بعد بھلا قبولِ اسلام میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی؟

حلیفوں کو ایک دوسرے کی وفاداری کا بھی انداز ہوتا ہے۔ عہدِ نبوی میں حلیف اور حریف بننے کا رواج تھا۔ ہر قبیلہ یا تو کسی کا حلیف تھا یا پھر حریف۔ نبی کریم ﷺ نے بنو شیبان سے رابطہ کیا تو ان کے زعما میں سے ایک مثنیٰ بن حارثہ شیبانی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اُنہوں نے نبی ﷺ سے پیغامِ حق سن کر عرض کیا:

"کسریٰ نے ہم سے عہد لیا ہوا ہے کہ ہم اس کے لیے خطرہ نہیں بنیں گے اور کسی ایسے شخص کو سپورٹ نہیں کریں گے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین... جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دے رہے ہیں... اسے ہمارے یہ بادشاہ ناپسند سمجھیں گے۔ تو اگر آپ چاہیں تو ہم عرب کے چشموں سے متصل علاقوں میں آپ کو جگہ بھی دیں گے اور مدد بھی کریں گے۔"

رسول ﷺ نے فرمایا: "آپ لوگوں نے جب سب کچھ سچ بتادیا تو ایسا صاف جواب دے کر کوئی برائی نہیں کی۔ یقیناً یہ اللہ کا دین ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو ہر جانب سے اس کی تائید کرتا ہے۔ قریب ہی ایسا وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے دیار واموال کا وارث بنادے گا۔"[1]

وقت گزرتا گیا۔ سیدنا مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور عراق کے محاذ پر دشمن سے برسرپیکار اسلامی فوج کے یہی سالار تھے۔ پھر فارس سے نبرد آزمائی کا موقع آیا تو سیّدنا مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنو شیبان نے اسلام کی نصرت وحمایت اور بہادری ودلیری کی شاندار تاریخ رقم کی۔ جو قبیلہ کسریٰ کی نافرمانی پر راضی نہیں تھا، اب وہی قبیلہ اسی کسریٰ کے مدمقابل تھا۔

اسی طرح غزوۂ احزاب کے موقع پر جب بنو قریظہ نے عہد شکنی کی۔ تو انہی میں سے ایک سرکردہ شخص کعب بن اسد قرظی عہد پر قائم رہا۔ جب حیی بن اخطب نے اسے عہد شکنی کا کہا تو اس نے ان الفاظ میں جواب دیا: "افسوس تجھ پر، حیی! میں جس عہد پر قائم ہوں، مجھے رہنے دو۔ میں نے محمد (ﷺ) میں ہمیشہ سچائی اور وفاداری ہی دیکھی ہے۔"[2]

یہی کعب بن اسد تھا جس نے محاصرے کے دوران اپنی قوم کو اسلام کی دعوت بھی دی کہ ہم اس شخصیت (رسول ﷺ) کی بیعت بھی کرلیں اور تصدیق بھی کریں۔ اللہ کی قسم! یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے فرستادہ نبی ہیں۔ اور یقیناً وہی ہیں جن کا تذکرہ تمہاری کتاب میں موجود ہے، مگر بنو قریظہ نے انکار کردیا۔[3]

یہودی ہونے کے باوجود کعب بن اسد قرظی اپنی قوم میں دین محمد ﷺ کا سفیر بن گیا۔ اس کی وجہ وہی تعلق، عہد کی پاسداری اور وفاداری تھی، جو سیرت کا طرہ امتیاز ہے۔

---

۱ الاکتفاء: ۱/۲۳۹

۲ السیرۃ النبویۃ از ابن ہشام: ۲/۲۲۰

۳ سمط النجوم: ۱/۳۱۲

۳۔ بین الاقوامی سطح پر ترویج اسلام

نامہ ہائے مبارک جو آس پاس کی حکومتوں، باج گزار ریاستوں اور قبیلوں کو بھیجے گئے، ان کا بنیادی مقصد دعوت تھا۔ یہ مکاتب باہمی تجارت کے فروغ، تہذیب وثقافت کے تبادلے یا باہمی تعلقات کو پروان چڑھانے کے لیے نہ تھے، جیسا کہ آج کل سفارتکاری کا مطلب سمجھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے وقت کی سپر پاور کو تحریر بھجوائی تو اس میں یہ بھی رقم تھا: «فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الأَرِيسِيِّينَ»[1]

"اگر تو نے (اس دعوت سے) بے رخی برتی تو تیری رعایا کا گناہ بھی تیرے سر ہو گا۔"

ان نامہ ہائے مبارک کا محور دعوتِ اسلام ہی تھا جیسا کہ حدیث میں ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے (شاہِ فارس) کسریٰ، (شاہِ روم) قیصر اور (شاہ حبشہ) نجاشی اور ہر ایک حکمران کی طرف خطوط روانہ کیے۔ آپ ﷺ نے اُنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔[2]

نبوی مکاتیب کے مختلف انداز سے جوابات آئے۔ کسی کے حصے میں سعادت آئی، کسی کے حصے میں شقاوت اور کئی محرومی کا شکار رہے۔ ان خطوط کی بہت سی تفصیلات ومندرجات ہیں لیکن موضوع سے متعلقہ نکتہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کسی ریاست سے سفارتکاری کے راہ ورسم بڑھائے تو اس کی بنیاد یہی دعوت تھی۔

کبھی آپ اپنے سامنے مکاتیبِ نبویہ کا نقشہ کھول کر بیٹھیں، پھر غور کریں کہ مدینہ منورہ کے تمام اطراف وجہات میں نبی ﷺ نے دعوت نامے کس اہتمام سے بھجوائے اور کسی بھی جہت کو خالی نہیں چھوڑا۔ اور دعوت نامے رائج الوقت نظام کے تحت بھجوائے۔ حتیٰ کہ نبی ﷺ نے اپنے نام کی مہر بھی اسی وجہ سے بنوائی کہ قیصر وکسریٰ مہر کے بغیر خط قبول نہیں کرتے تھے۔

۴۔ متعدد قبائل میں نکاح کر کے اسلام کا فروغ

نبی کریم ﷺ نے متعدد قبائل میں نکاح کیے تھے۔ نکاح کے اہم مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ ان قبائل میں دعوت کو عام کیا جائے۔ اس کے اثرات کسی نہ کسی صورت رونما ہوتے رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مکی دور میں ایسا اقدام کیوں نہ کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت سے سرفرازی اور دعوت پھیلنے کے بعد بہت سی مشکلات آن پڑی تھیں۔ نبی

---

۱ صحیح بخاری: ۲۹۳۶

۲ صحیح مسلم: ۴۷۰۹

مکرم ﷺ، آپ کے اہل بیت اور اصحاب رضی اللہ عنہم دورِ ابتلا سے گزر رہے تھے۔ آپ ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مزید نکاح کر کے ازواج کو بھی مشکلات میں ڈالیں۔ یہ قضیہ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے واقعے پر قیاس ہے۔ جب سیّدنا عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور سوالات کر کے آپ ﷺ کی معیت اور رفاقت میں رہنے کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّك لَا تَسْتَطِيْعُ ذٰلِكَ يَوْمَكَ هٰذا اَلَا تَرٰى حَالِيْ وَحَالَ النَّاسِ وَلٰكِنِ ارْجِعْ اِلٰى اَهْلِكَ فَاِذَا سَمِعْتَ بِي قَدْ ظَهَرْتُ فَاْتِنِي»[1]

"بے شک تم اس وقت کی طاقت نہیں رکھ پاؤ گے، کیا تم نے میرا اور ان دشمنوں کا حال نہیں دیکھا۔ اب تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ پھر جب تم میرے بارے میں غلبے کا سنو تو تب میرے پاس آجانا۔"

اسی طرح کا اظہار آپ ﷺ نے سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی فرمایا تھا، جب وہ آپ ﷺ سے دعوت سن کر اسلام لے آئے تھے، فرمایا: « ارْجِعْ إِلَى قَوْمِكَ فَأَخْبِرْهُمْ حَتَّى يَأْتِيَكَ أَمْرِي »[2]

"اپنی قوم میں واپس چلے جاؤ اور انہیں بھی روشناس کراؤ یہاں تک کہ میرے اس معاملے کے متعلق کوئی خبر وغیرہ آپہنچے۔"

اگر مرد حضرات کے لیے آپ ﷺ کی یہ احتیاط تھی تو آپ خواتین کو ازواجِ مطہرات اور مؤمنوں کی اُمہات بنا کر کیونکر انھیں مشکلات میں ڈالتے؟ لہٰذا سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد صرف سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا اور اس کے بعد سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے، اور اس کے بعد دیگر امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن سے نکاح ہوتے رہے۔ مختلف بڑے اور ذیلی قبائل کے ہاں آپ ﷺ کی تکریم میں اضافہ ہوا۔ جس جس قبیلے میں نکاح ہوتا گیا اس اس قبیلے کے افراد آپ ﷺ کے گرویدہ اور اسلام کے شیدا بنتے گئے۔

غزوۂ بنو مصطلق کے بعد جب نبی کریم ﷺ کا نکاح سردار قبیلہ حارث بن مصطلق کی صاحبزادی اُمّ المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بنو مصطلق کے جو جو گرفتار قیدی موجود تھے، اُنہوں نے سب کو رہا کر دیا۔ اس وجہ سے کہ اب وہ رسول اللہ کے سسرالی بن چکے تھے۔[3] مسلمانوں کی اس فیاضی کو دیکھ کر بنو مصطلق اسلام لے آئے۔ اس طرح آپ ﷺ نے جتنے نکاح کیے، ان کا اہم مقصد بھی اسلام کا فروغ اور حمایت تھی۔

---

۱ صحیح مسلم: ۱۹۶۷

۲ صحیح بخاری: ۳۸۶۱

۳ سنن ابو داؤد: ۳۹۳۳

اصطلاحات کی جنگ

طاہر الاسلام عسکری (مدیر مجلہ نظریات، لاہور)

جنگیں اگرچہ توپ و تفنگ سے لڑی جاتی ہیں لیکن ان کا اصل میدان عقائد و افکار کے مباحث ہیں۔ آج عالم کفر جہاں ملتِ اسلامیہ پر آتش و آہن کی بارش برسا رہا ہے وہیں اس کے تھنک ٹینکس ہمارے تصورِ زندگی اور مذہبی و معاشرتی اقدار کو بدلنے کے لیے بھی دن رات کوشاں ہیں۔ الفاظ و مصطلحات چوں کہ پوری تہذیب کی نمائندہ ہوتی ہیں، اسلیے انھیں بگاڑنے کے لیے وہ تمام تر توانائیاں صرف کر رہے ہیں؛ اس ضمن میں استعمار اور ان کے کارندوں کے یہاں مختلف اسالیب بروے کار لائے جاتے ہیں جن کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے:

تلبیس: ترویج باطل کا ایک کارگر اسلوب

① باطل کی ترویج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اصطلاحوں کی اصل حقیقت کو مستور رکھتے ہوئے ان کے خود ساختہ مفاہیم کو رواج دیا جائے، مثلاً سیکولرزم کو فروغ دینے کے لیے اس کا یہ معنیٰ بیان کرنا کہ "ہر ایک کو اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی ہے اور اس پر کوئی جبر نہیں۔" بعض سادہ لوح اس فریب کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس کا یہی مطلب ہے تو ایک نئی اصطلاح کی حاجت ہی کیا ہے؟

مزید یہ کہ اہل مذہب کو یہ دھوکا دیا جائے کہ مذہب تو خود جبر کی نفی کرتا ہے، پس اس طرح اسلام خود سیکولر مذہب ہے۔ لیکن جب سیکولرزم کو منوالیا تو پھر اصل نظام رائج کر دیا کہ مذہب کا سیاست و ریاست، آئین و قانون اور اقتصاد و معیشت سے کوئی تعلق نہیں، اور یہ کہ مذہب کو مسجد و مندر کی چار دیواری تک محدود رکھو!

اصطلاحوں کے گم راہ کن اور دل فریب تراجم

② باطل افکار و نظریات پھیلانے کے لیے اہل باطل جو مختلف ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں، ان میں ایک تکنیک یہ ہے کہ تباہ کن مفاہیم کی حامل اصطلاحوں کو ایسے خوش نما الفاظ میں دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے کہ اصل حقیقت پوشیدہ رہے اور لوگ التباسِ فکری میں مبتلا ہو جائیں۔ مثلاً Democracy کا ترجمہ 'جمہوریت' کرنا؛ حالاں کہ جمہوریت اس کا درست ترجمہ نہیں ہے، بلکہ 'عوام کی حاکمیت' اس کا صحیح مفہوم ہے۔ اور معنویت کے لحاظ سے جمہوریت میں اکثریت کی اقلیت پر جبری حکومت ہوتی ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ اسلامی لٹریچر میں موجود جمہور علما کی ترکیب سے ڈیموکریسی کے جواز پر استشہاد کیا جانے لگا جبکہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ جمہور علما کے موقف کو قرینۂ ترجیح کے طور پر اس وقت بیان کیا جاتا ہے جب حکم شرعی کی شرح و توضیح میں اہل علم کا اختلاف ہو

جائے، جبکہ ڈیموکریسی میں شریعت کا کوئی دخل مانا ہی نہیں جاتا۔

③ اسی طرح اقوامِ متحدہ کی دستاویزات میں Women Empowerment کو عربی میں تمکین المرأة (عورت کو تمکین دینا) سے تعبیر کیا گیا تو اس پر علما نے نقد کیا اور وضاحت کی کہ اس کا صحیح ترجمہ استقواء المرأة بنتا ہے، یعنی 'عورت کو قوت دینا' یا قوی کرنا تاکہ وہ مردوں سے اپنے حقوق کے لیے جنگ کر سکے۔ یہ لفظ اصلاً Feminist تحریک کے ایک تصور کو بیان کرتا ہے جو اسلامی مفاہیم سے قطعی متصادم ہے۔ تمکین تو اسلام نے عورت کو پہلے ہی سے عطا کر رکھی ہے اور اس کے تمام حقوق کی مکمل نگہداشت کرتے ہوئے مردوں کو ان کی ادائیگی کا پابند کیا ہے۔

④ اسی طرح عربی زبان میں سیکولرزم کا ترجمہ العلمانیة کیا گیا لیکن یہ بھی بالکل غلط اور دور از کار ہے کیوں کہ یہ عربی لفظ علم سے مشتق ہے جب کہ Secularism میں علم کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اس کا صحیح مفہوم 'لادینیت' یا مذہب کو دیگر امورِ زندگی (بہ شمول سیاست، قانون، معیشت، معاشرت) سے یک قلم جدا کر دینا ہے کہ ان معاملات میں اس کا کوئی کردار نہ ہو۔

غیر اسلامی تناظرات کا مسلم تہذیب پر اطلاق

⑤ بعض الفاظ ایسے ہیں جو یورپ کے قرونِ مظلمہ Dark Ages میں چرچ اور دیگر طبقہ ہائے فکر کے مابین ہونے والی آویزشوں کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے؛ مثلاً Fundamentalist جس کا ترجمہ عربی میں الأصولیة اور اردو میں 'بنیاد پرستی' کیا جاتا ہے۔ یہ منفی معنوں میں مستعمل ہے کیوں کہ اس سے اہل کلیسا کا وہ رویہ مراد لیا جاتا ہے جو انھوں نے نئے سائنسی نظریات کے بالمقابل اپنایا کہ انھیں خلافِ مذہب قرار دے کر یکسر مسترد کر دیا جائے، حالانکہ یہ جدید نظریات اصل مذہب کے بجائے مذہب کے نام پر خود تراشیدہ مذہبی تشریحات کے خلاف تھے۔ اسلام میں ایسی کسی جنگ و پیکار کا وجود ہی پایا نہیں جاتا کہ انسانی تجربات و اکتشافات اور ان کے حاصلات اصلاً دین کا موضوع ہی نہیں ہیں؛ اس کا بنیادی محور خیر و شر اور ہدایت و ضلالت کے مباحث ہیں؛ پس سائنسی نظریات سے اسلام کو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، الاّ یہ کہ سائنس کا نام لے کر غلط طور پر عقائد و ایمانیات میں دخل اندازی کی کوشش کی جائے۔ اسلام میں بنیاد پسندی قابل تحسین ہے، بہ ایں معنیٰ کہ بنیادی عقائد و افکار سے وابستگی رکھی جائے اور ان سے سرِ مو انحراف نہ کیا جائے۔

⑥ اسی طرح کا ایک لیبل Theocracy ہے جسے 'پاپائیت' کہہ کر بے تکلفی سے علما پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ تھیا کریسی، دراصل مذہبی پیشواؤں Priests کے حکومت و اقتدار سے عبارت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پوپ کا فرمایا ہوا گویا خدا کا فرمان ہے، اور مذہب و قانون وہی ہے جو اس کی زبان سے نکلے۔ اس کے برعکس اسلام میں علما کو ایسی کوئی مذہبی اتھارٹی حاصل نہیں ہے؛ دین و مذہب محض وحی و تنزیل میں محصور ہے؛ علما بھی دیگر لوگوں کی مانند

اس دین پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ باقی علما کی تشریحات ہیں جو اجتہاد کے زمرے میں داخل ہیں اور اجتہاد جب تک اجماع (یعنی پوری اُمت کے اتفاق) میں نہ ڈھلے، ظنی رہتا ہے جس سے علمی اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔

مختصراً یہ کہ ایسی اصطلاحیں اسلامی تہذیب میں فِٹ ہی نہیں بیٹھتیں کہ ان کا تناظر خالصتاً دوسری تہذیب اور غیر مذہب سے جُڑا ہوا ہے جو یہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

متفقہ اسلامی اصطلاحوں میں تحریف

⑦ مسلمانوں میں بعض تجدد پسند دانشور، جو جانے انجانے میں استعمار کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں، اپنی خود ساختہ تشریحات و تعبیرات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے صدیوں سے مروّج مذہبی لفظیات کو نت نئے معانی پہناتے ہیں؛ یعنی لفظ پرانا اور شرح نئی! مثال کے طور پر 'سنت' کا لفظ لیجیے؛ یہ فقہ، عقیدہ اور اُصول کی معروف اصطلاح ہے اور عمومی طور پر جب کتاب و سنت کی ترکیب بولی جائے تو ہر مسلمان اس کا یہی مفہوم سمجھتا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال و ارشادات اور افعال مراد ہیں جو کتبِ حدیث میں مندرج ہیں لیکن اب بعض اربابِ فکر نے اس کے معنیٰ یہ بیان کیے ہیں کہ "سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔"

اس اصطلاح کا یہ مفہوم ہمارے مذہبی لٹریچر میں کبھی بیان نہیں ہوا؛ بنابریں یہ نادرست ہے کیوں کہ یہ فکری التباس کا باعث بنتا ہے اور عام مخاطب اس سے وہی مراد لیتا ہے جو علماء کے یہاں معروف ہے۔ پھر اس سے وہ تمام اُمور سنت کے اطلاق سے خارج ہو جاتے ہیں جو اس تعریف پر پورا نہیں اترتے لیکن احادیث کے دفاتر میں درج ہیں اور مسلمان انھیں سنت سمجھ کر ہی ان پر عمل پیرا ہیں۔ ان اہلِ دانش سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ اپنے تصورات کی تعبیر کے لیے نئے الفاظ وضع کریں تاکہ غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔

مبہم اصطلاحیں

⑧ بعض ایسے الفاظ اور اصطلاحیں مشہور کی جاتی ہیں جن کا مفہوم انتہائی مبہم ہوتا ہے لیکن انھیں مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے Terrorism یا دہشت گردی۔ آج تک دہشت گردی کی کوئی جامع تعریف متعین نہیں کی جا سکی چناں چہ اپنے حقوق کی خاطر ہتھیار اُٹھانے والے گروہوں کو بے تامل دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ طاقت ور ملکوں کی جانب سے کم زور ممالک کی حکومتوں کو ختم کرنے کے لیے فوجی کارروائیوں کو دہشت گردی نہیں کہا جاتا۔ اسی منطق کی رو سے کشمیر میں مسلمانوں کا بھارتی فوج سے لڑنا تو دہشت گردی ہے لیکن عراق پر امریکی حملہ ہرگز دہشت گردی نہیں ہے۔

⑨ یہی معاملہ Extremism یا 'انتہا پسندی' کا ہے کہ عام طور سے مذہبی طبقات کو انتہا پسندی کا طعنہ دیا جاتا ہے؛

خصوصاً وہ لوگ جو اسلامی شریعت کے نفاذ کی جدوجہد میں مشغول ہوں اور شرعی قوانین پر عمل پیرا ہوں، انھیں انتہاپسند کا خطاب دیا جاتا ہے۔ لیکن اس اصطلاح کی بھی کوئی واضح اور متعین تعریف موجود نہیں ہے کہ اس کا معیار اور کسوٹی کیا ہے؟ کب کسی شخص یا گروہ کو انتہاپسند کہا جائے گا؟ اگر سیکولر اقدار و قوانین کی پابندی انتہاپسندی نہیں ہے تو مذہبی تصورات اور قواعد وضوابط کے نفاذ کا مطالبہ انتہاپسندی کے دائرے میں کیوں کر داخل کیا جاسکتا ہے؟

شرعی اصطلاحوں کی گھناؤنی تشریح

مغربی میڈیا نے، جو دراصل ان کی فکری یلغار کا ایک مؤثر ترین وسیلہ ہے، آج شرعی اصطلاحوں کو بہت ہی غلط معانی پہنا دیے ہیں اور انھیں اس قدر گھناؤنے تصورات سے جوڑ دیا ہے کہ لوگ انھیں سن کر ہی وحشت میں مبتلا ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ عام مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً جہاد کو دہشت گردی، خلافت کو ظالمانہ بادشاہت و موروثیت یا مذہبی پیشواؤں کی حکومت، حدود و تعزیرات کو ظلم و تشدد اور حجاب کو پس ماندگی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ آج اچھے بھلے پڑھے لکھے مسلمان بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ خلافت تو قبائلی معاشرے کا نظام تھا، آج اس کے قیام کی جدوجہد کا کیا فائدہ؟ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہمیں مغرب کے توحش کو دیکھتے ہوئے ان اصطلاحوں سے دست کش ہو کر انھی کی اصطلاحیں اپنا لینا چاہییں اور خلافت کے بجاے جمہوریت کی اصطلاح کو رواج دینا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اصطلاحات کے حقیقی مفاہیم کو اجاگر کیا جائے اور مغرب کے اس مکروہ پراپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا جائے۔

اصطلاحوں کی اسلام کاری

اصطلاحات کے باب میں ایک خلط یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر اسلامی تہذیب سے ایک اصطلاح لے کر اس کے ساتھ اسلامی کا سابقہ لگا دیا جاتا ہے اور یوں گویا ایک کافرانہ تصور کو مشرف بہ اسلام کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلامی اشتراکیت، اسلامی سوشلزم اور اسلامی جمہوریت، اسلامی بینکاری اسی نوعیت کی اصطلاحیں ہیں حالاں کہ یہ اسلام سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تصورات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ہمیں اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار و تصورات کی تعبیر کے لیے اپنے اسلاف سے منقول مذہبی لٹریچر میں مستعمل لفظیات کو رواج دینا چاہیے تاکہ کفر و اسلام کے نظریات میں فرق و امتیاز باقی رہے اور اسلامی عقائد التباس کا شکار نہ ہوں جیسا کہ فی زمانہ ہم بچشم سر اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں!

حرفِ آخر: اصطلاحوں کا مسئلہ بڑی دقتِ نظر اور تعمق فکر کا متقاضی ہے۔ اربابِ علم و تحقیق کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی فکر و فلسفہ اور اسلامی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے ان کے باہمی تضادات و امتیازات کو اجاگر کریں اور افرادِ امت کو اس فکری بحران سے نجات دلانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

تفسیر 'تدبر قرآن' کے بارے میں حسن ظن کے چند اسباب

اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تضادات

حافظ صلاح الدین یوسف

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے آخری دور میں ان کے نظریات میں، اُن کی زندگی کے دورِ اوّل کے مقابلے میں، خاصی تبدیلی بلکہ انحراف آگیا تھا۔ دورِ ثانی کی تحریروں سے، جن میں ان کے دروس پر مبنی صحیح بخاری کی شرح (دو جلدیں) اور تفسیر 'تدبر قرآن' اور 'مبادیٔ تدبر حدیث' وغیرہ شامل ہیں، فتنۂ انکار حدیث کو بڑی تقویت ملی، کیونکہ ان کتابوں میں بے دردی سے احادیثِ صحیحہ اور مسلّماتِ اسلامیہ کا انکار کیا گیا ہے۔

مولانا حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے ان کی شرح صحیح بخاری اور تفسیر میں ان کے انحرافات کا علمی و تحقیقی جائزہ لیا ہے جو کتابی صورت میں زیر طبع ہے۔ ذیل کا مضمون اُن کے ردود و مناقشات کا آخری حصہ ہے تاکہ اُن تناقضات کو سامنے رکھتے ہوئے اُن کے انحرافات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ (ادارہ)

صریح انحرافات کے باوجود اصلاحی صاحب کے علم و فضل کا اتنا شہرہ کیوں ہے؟ اور متعدد اہل علم ان کی تفسیر کو اسی طرح ایک منفرد اور 'شاہکار تفسیر' کیوں سمجھتے ہیں جس طرح کہ فراہی حلقہ اور ان کے ارادت مند باور کراتے ہیں؟ ہمارے خیال میں اس کے دس بڑے اسباب ہیں:

① اصلاحی صاحب کے اس تفسیر اور اس کے اندازِ تفسیر کے بارے میں بلند بانگ دعوے اور اسی تال سر میں ان کے حلقۂ ارادت کی نغمہ سرائی۔

② انشاو تحریر کا زور دار انداز اور زبان و بیان کی خوبی۔ یہ اللہ کی خاص عطا تھی جس سے اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ یہ تفسیر بلاشبہ اس میں منفرد ہے اور انشاو تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن جس طرح ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، زبان و بیان کی خوبیاں بھی زہر ہلاہل کو قندِ شیریں نہیں بنا سکتیں۔

③ بہت سے اہل علم اس کی سحر بیانی میں چھپی ہوئی زہرناکی کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ابھی تک غالباً قاصر ہیں اور اسکے مدح سراؤں میں شامل ہو کر بے سوچے سمجھے اس کی مداح سرائی میں مشغول ہیں۔ ھداھم اللہ

④ اس تفسیر کی مذکورہ گمراہیوں اور انحرافات کا ابھی تک کسی صاحب نے بھرپور انداز میں علمی و تحقیقی جائزہ بھی لے کر اس کو واضح نہیں کیا ہے۔ صرف ایک صاحب کی تفصیلی کتاب منظر عام پر آئی ہے جس میں ان کی سوانحی تفصیلات اور افکار کا جائزہ ہے۔ لیکن ان صاحب نے ان کے بعض افکار پر نقد تو کیا ہے لیکن زیادہ تر ان کی ہم نوائی ہی کی ہے۔ راقم نے الحمد للہ پہلی مرتبہ 'تدبر قرآن' کے تفسیری اصولوں کی ناحکمی بھی واضح کی ہے اور 'مسلماتِ اسلامیہ سے انحرافات' کی مدلل تردید بھی۔

اس تفسیر کی گمراہیوں کی عدم وضاحت نے بھی اس تفسیر کی بابت اچھے تاثرات قائم کر رکھے ہیں حتی کہ بہت سے صحیح الفکر اہل علم بھی اس پر تنقید کو ناپسند کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس کی فکری گمراہیوں کے معترف بھی ہیں۔ یہ رویہ اگرچہ جذبۂ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے خلاف ہے جو کسی بھی صاحبِ علم کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ان کا فریضہ تو حق کی حمایت و وضاحت اور باطل کی تردید ہے، نہ کہ اس کے بارے میں مداہنت کا مظاہرہ تاہم مداہنت یا مصلحت کا یہ رویہ اکثر دیکھنے میں آرہا ہے۔

⑤ آج کل قرآن کی تفسیر میں احادیث کا انکار اور اس سے اعراض و گریز کر کے جدت پسندی، یعنی قرآن کے نام پر نئے نئے نظریات پیش کرنے کو ایک حلقہ بہت پسند کرتا ہے۔ اس تفسیر میں بھی ان کے اس ذوقِ 'جدت طرازی' کا وافر سامان موجود ہے۔

⑥ انکارِ حدیث کا فتنہ بھی روز افزوں ہے اور خرقِ عادت واقعات (معجزات) کی بھی کوئی نہ کوئی مادی توجیہ اور اس کو اسباب ہی کی کرشمہ کاری باور کرانے کا رجحان بھی، جس کا آغاز سرسید احمد خاں نے کیا، فروغ پا رہا ہے۔ اور سرسید کی یہ دونوں گمراہیاں 'تدبر قرآن' میں بھی موجود ہیں۔

⑦ تمام مفسرین اُمّت کو قرآنی علوم و معارف سے ناآشنا قرار دینا اور باور کرانا، یہ بھی جدید مفسرین کی ایک ضرورت ہے کیونکہ ان کو کنڈم کیے بغیر یا ان کی تفسیری کاوشوں کی بے توقیری کے بغیر، مفسرین اُمت کی تفسیر کے برعکس، اپنی من مانی تفسیر، یا لغت کے بل پر تفسیر یا احادیث سے گریز پر مبنی تفسیر اُمتِ مسلمہ میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ 'تدبر قرآن' بھی چونکہ ایسی ہی ناقابل قبول تفسیر ہے۔ اس لیے اس میں بھی جگہ جگہ مفسرین اُمت کی بابت عجیب عجیب الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تاکہ ان کی تفاسیر کی اہمیت کو کم کیا جا سکے۔

⑧ فکرِ فراہی ہی کو قرآن فہمی کی شاہ کلید سمجھنا اور سمجھانا، اور اسی کی روشنی میں ساری تفسیر کرنا، یہ فراہی حلقے یا اس کے متاثرین میں بہت پسندیدہ بات ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کے نزدیک تفسیر 'تدبر قرآن' چودہ سو سالہ تفسیروں میں پہلی کامیاب تفسیر ہے۔

⑨ کسی چیز کی حسن و زیبائی کا پروپیگنڈا کر کے اس کے لیے کشش پیدا کرنا اور اس کو مقبول عام بنانا اس دور کا کامیاب حربہ ہے۔ اس تفسیر کی خوبیوں کے پروپیگنڈے نے بھی بہت سے لوگوں کو متاثر کیا ہے اور وہ سوچے سمجھے یا اسے پڑھے بغیر اس پر ایمان بالغیب لے آئے۔

⑩ سب سے زیادہ اہم بات اس تفسیر کی اصل حقیقت کے مخفی رہنے اور اس کے رازہائے سربستہ کے نہ کھلنے میں اصلاحی صاحب کا فکری تضاد ہے۔ موصوف کے دو چہرے یا دو فکری رویے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بلکہ باہم متضاد ہیں۔

موصوف کا ایک چہرہ یا ایک فکری رویہ تو وہ ہے جو ان کے دور اوّل کا ہے۔ اس میں وہ صحیح نظریات کے حامل اور اہل سنت کے موقف کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس دور میں ان کے قلم سے جو کتابیں منظر عام پر آئیں، وہ دورِ ثانی کے چہرے یا فکری رویے سے مختلف ہیں۔ اس دورِ اوّل کی بعض کتابوں کے نام راقم نے اپنی زیر طبع کتاب 'حدیث اور ائمہ حدیث پر مولانا اصلاحی کی کرم فرمائیاں' کے عرض مؤلف میں بیان کیے ہیں۔

جن لوگوں نے ان کے دورِ اول کی کتابیں اور تحریریں پڑھی ہیں، ان کے دل و دماغ میں اصلاحی صاحب کی عظمت کے نقوش ثبت ہیں۔ اور دورِ ثانی کی تحریریں جن میں شرح موطا امام مالک اور صحیح بخاری کے منتخب ابواب کے دروس پر مبنی شرح کی دو جلدیں، مبادیٔ تدبرِ حدیث اور تفسیر 'تدبر قرآن' نمایاں ہیں، ان کو انہوں نے پڑھا ہی نہیں ہے اور اگر پڑھا ہے تو ان کی عظمت کے اوّلین نقوش نے ان کو اپنے گھیرے میں لیے رکھا اور وہ ان نئے افکار میں چھپی ہوئی زہرناکی کو سمجھنے ہی سے قاصر رہے۔ یا دورِ اول کے ان کے چہرے کی تابانی نے دورِ ثانی کے چہرے کی سیاہی پر پردہ ڈال دیا اور فکر و نظر کی یہ روسیاہی بھی ان کو روشن اور تابناکی ہی نظر آئی۔ اس پر ہم اس کے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں:

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا!!

بہر حال ان عشرہ کاملہ میں سے نو نکتے تو ایسے ہیں جن پر ہم اپنی کتاب میں بخوبی تفصیلات پیش کر چکے ہیں۔ تاہم دسواں نکتہ 'فکر و نظر کا تضاد' یقیناً نہایت اہم اور مزید وضاحت اور دلائل کا متقاضی ہے کیونکہ اس کے بغیر 'تدبر قرآن' کے فکری انحرافات اور صریح گمراہیوں کو صحیح معنوں میں سمجھنا مشکل ہے۔ بنابریں اصلاحی صاحب کے تضادات کی وضاحت نہایت ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور غیر مبہم دلائل سے اس کی وضاحت کریں گے۔ ان شاء اللہ، بعون اللہ وتوفیقہٖ

ان تضادات کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ ان کے منظر عام پر نہ آنے ہی کی وجہ سے ان کی شخصیت پر پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ ان کی تفسیر کو گمراہ کن سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے اس نکتے کی وضاحت ایک

آئینہ حقیقت نما کی حیثیت رکھتی ہے۔

اصلاحی صاحب کے تضادات: ایک آئینۂ حقیقت نما

۱۔ مسئلۂ حیاتِ مسیح ورفع آسمانی

یہ عقیدہ چودہ سو ۳۷سال سے مسلم چلا آرہا ہے کہ ”حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے بلکہ ان کو زندہ ہی آسمان پر اُٹھالیا گیا اور قیامت کے قریب اُن کا آسمان سے دنیا میں نزول ہوگا اور ان کے ذریعے سے شریعت کا احیا اور نفاذ عمل میں آئے گا۔“

یہ عقیدہ اہل سنت کا مسلّمہ عقیدہ ہے جو قرآن وحدیث کی واضح تصریحات سے ثابت ہے۔ اس بارے میں احادیث بھی متواترہ ہیں جو تقریباً ۸۵ صحابہ سے مروی ہیں اور ان کے علاوہ آثارِ صحابہ بھی دو درجن سے زیادہ ہیں۔ اس کی تفصیل راقم نے اپنی کتاب ’فتنہ غامدیت‘ میں بیان کی ہے۔ نیز علمائے اسلام کی یہ تصریحات بھی ذکر کی ہیں کہ اس عقیدے کا منکر ملحد اور زندیق ہے۔

متحدہ ہند میں، جب یہاں انگریز کی حکومت تھی، متنبیٔ قادیان مرزا غلام احمد قادیانی نے سب سے پہلے اس مسلّمہ اسلامی عقیدے کا انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ مسیح علیہ السلام تو فوت ہوچکے اور احادیث میں جس مسیح کی آمد کی پیش گوئی کی گئی ہے، وہ میں ہی ہوں۔ تو علمائے اسلام کی طرف سے اس کی تردید میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات (یعنی زندہ آسمان پر اٹھا لیے جانے) اور قیامت کے قریب دوبارہ آسمان سے نزول کے اثبات میں دو چار نہیں، بیسوں کتابیں لکھی گئیں جن کی تفصیل ’احتسابِ قادیانیت‘ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

یہ کتاب جس کی ساٹھ جلدیں چھپ چکی ہیں، اس میں رد قادیانیت پر لکھی گئی ساری کتابیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس میں وہ ساری علمی کاوشیں، کتاب اور اس کے مؤلف کے ناموں کے ساتھ شامل ہیں جو صرف مسئلہ زیر بحث پر کی گئی ہیں۔ ان کی تعداد ہی درجنوں میں ہیں۔

رفع آسمانی کا اثبات

اصلاحی صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کا اثبات کیا ہے۔ گویا وہ اس عقیدے کے قائل ہیں۔ اور قرآن مجید کی آیت ﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾[۱] کی تفسیر میں بڑے زور دار انداز سے اس عقیدے کا

۱ سورۂ آل عمران:۵۵

اثبات کیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا انکار اور 'اُٹھائے جانے' کا بڑی وضاحت سے اعتراف کیا ہے، یہ بحث تقریباً چار صفحات پر محیط ہے۔[1]

سورۃ النساء کی آیت: ۱۵۶ تا ۱۵۸ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ... بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ کی تفسیر میں بھی اسی موقف کا مختصراً اثبات کیا ہے۔[2]

مذکورہ عقیدے کے دوسرے حصے (آسمان سے نزول) کا انکار

تاہم علماے اسلام اور اُمّتِ مسلمہ کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ رفع آسمانی کا مطلب، زندہ اُٹھانا ہے نہ کہ موت سے ہم کنار ہونا۔ اس عقیدے کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا ہے (جس کو اصلاحی صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے) تو اُن کو موت کب آئے گی؟ جب کہ قرآن کریم[3] کی رو سے ہر انسان کے لیے موت لازمی ہے کسی انسان کو موت سے استثنا حاصل نہیں ہے۔ اس کا حل یا جواب احادیثِ صحیحہ متواترہ میں موجود ہے اور وہ یہ کہ

> "قیامت کے قریب حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو گا اور انہی کے ہاتھوں سے دجال کا قتل ہو گا، ان کے ذریعے سے شریعتِ اسلامی کا احیا اور نفاذ بھی عمل میں آئے گا اور پھر وہ موت سے ہم کنار ہوں گے۔"

اصلاحی صاحب کا فرمان ہے کہ

> "اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح باعزت طریقے سے اٹھالیا جس طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اُٹھالیا، سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر کو اُٹھالیا اور اپنے تمام باعزت بندوں کو اٹھالیتا ہے۔"[4]

قارئین کرام اندازہ لگائیں کہ 'اُٹھائے جانے' کا اثبات تو خوب زور شور سے کیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ نزول کا انکار بھی اسی زور شور سے ہے جب کہ احادیث سے نزول کا اثبات ہو رہا ہے؟ علاوہ ازیں اٹھائے جانے سے مراد تفسیر میں تو اللہ کا اپنی طرف اُٹھانا لیا ہے لیکن شرح صحیح بخاری کے اقتباس میں طبعی موت مراد لیا ہے۔ یہ کیسا عجیب تضاد ہے یا انکارِ حدیث کا کیسا واشگاف اعلان و اظہار ہے۔

پتہ نہیں اتنی واضح گمراہی اور مسلمہ عقیدے کے انکار کو اصلاحی صاحب کا حلقۂ ارادت تسلیم کرتا ہے یا

---

۱ تفسیر 'تدبر قرآن' جلد اوّل، ص ۷۰۵ تا ۷۰۸، طبع اول ۱۹۶۷ء

۲ تفسیر 'تدبر قرآن' جلد دوم، ص ۱۹۶۔ ۱۵۴، طبع اول ۱۹۷۱ء

۳ سورۃ الانبیاء: ۳۴

۴ شرح صحیح بخاری از امین احسن اصلاحی: ۱/ ۵۰۹

بدستور ان کی مدح وتوصیف اور 'تدبر قرآن' کے گن ہی گاتا ہے؟

حلقۂ ارادت سے چند سوال

بہر حال ہمارے اصلاحی صاحب کے تلامذہ اور حلقۂ ارادت سے چند سوال ہیں:

① پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن مجید میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رَفع (اُٹھائے جانے) کا واضح الفاظ میں ذکر ہے بلکہ 'اپنی طرف' کی بھی صراحت ہے ﴿ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾[1] ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾[2] کیا محمد رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ و عمرؓ اور دیگر باعزت بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے 'اپنی طرف' یعنی آسمان ہی پر اُٹھا دیا ہے اور اس کے اُٹھانے کا یہی طریقہ ہے؟ یا کیا مطلب ہے؟

② دوسرا سوال یہ ہے کہ 'باعزت بندوں' کو تو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اپنی طرف اُٹھا لیتا ہے تو دوسرے بندوں کو جو 'باعزت' نہیں ہوتے، کس طرح اٹھاتا ہے؟

③ تیسرا سوال یہ ہے کہ اپنی طرف اُٹھانے سے مراد اگر موت ہے تو موت تو ہر شخص کو آتی ہے۔ اور آتی ہے تو 'باعزت' اور 'بے عزت' کی تفریق کیا مطلب ہے؟ کیا ان دونوں کو اُٹھانے کا مطلب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

④ چوتھا سوال یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دو جگہ 'وفات' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ﴿ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ ﴾[3] ﴿ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ ﴾[4] تمام مفسرین اُمت نے کہا ہے کہ وفات کے مجازی معنی 'موت' کے اور حقیقی معنی 'پورا پورا لینے' کے ہیں۔ اور قرآن کے ان دونوں مقامات پر وفات کے معنی 'پورا پورا لینے' کے ہیں کیونکہ قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دو مقامات 'اپنی طرف' اُٹھانے کی صراحت ہے۔[5] قرآنِ کریم کی یہ صراحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کو آسمان پر اٹھانے (پورا پورا لینے) کے معنی کو متعین کر دیتی ہے۔ اصلاحی صاحب نے بھی ان دونوں مقامات پر وفات کے معنی اٹھانے ہی کے کیے ہیں۔ اور اپنی طرف اٹھانے کا مطلب آسمان پر اُٹھانا ہی ہے۔

---

۱ سورۃ آلِ عمران:۵۵
۲ سورۃ النساء:۱۵۸
۳ سورۃ آل عمران:۵۵
۴ سورۃ المائدۃ:۱۱۷
۵ سورۃ آل عمران:۵۵؛ سورۃ النساء:۱۵۸

اب سوال یہ ہے کہ آسمان پر اُٹھانا تو تسلیم ہے تو اس کے بعد کیا ہوا؟ یا کیا ہو گا؟ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔ اُمتِ مسلمہ تو تسلیم کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب ان کا نزول ہو گا۔ لیکن فراہی گروہ اس نزول کا منکر ہے کیونکہ وہ حدیث کا منکر ہے۔ تو اس سوال کا جواب ان کے ذمے ہے کہ اگر وہ آسمان پر اٹھا لیے گئے (جیسا کہ متفقہ عقیدہ ہے) تو اب وہاں وہ کس طرح ہیں؟ کیا وہاں وہ زندہ ہیں یا وہاں موت سے ہم کنار ہو چکے ہیں؟

تفسیر 'تدبر قرآن' اور اصلاحی صاحب کی 'شرح صحیح بخاری' میں اس کی بابت متضاد صراحت ہے۔ حلقۂ اصلاحی اور طائفۂ فراہی دونوں اس سوال کی وضاحت فرمائیں۔ کیونکہ محض نزولِ مسیح کی احادیث کے انکار سے بات مکمل نہیں ہوتی، جب تک یہ صراحت نہیں کی جاتی کہ رفع آسمانی کے بعد کیا صورت حال ہے یا کیا ہو گی؟ نیز اُٹھائے جانے کا مطلب اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف اُٹھانا ہے جیسا کہ 'تدبر' میں ہے، یا اس سے طبعی موت مراد ہے جیسا کہ شرح صحیح بخاری میں صراحت ہے؟

دوسرے الفاظ میں قرآن کے اس 'ابہام' کو دور کرنا اصلاحی و فراہی گروہ کی ذمے داری ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کے نزدیک تو یہ مسئلہ 'مبہم' نہیں ہے بلکہ واضح ہے کیونکہ قرآن کے اجمالات کی تفصیل احادیث میں موجود ہے اور امّت کے نزدیک قرآن کا اجمال اور حدیث میں اس کی تفصیل دونوں ہی یکساں طور پر حجت ہیں۔ لیکن احادیث کے انکار سے جو 'ابہام' پیدا ہوا یا کیا گیا ہے، اسے دور کرنا انہی منکرین حدیث کی ذمے داری ہے جو احادیث کے بغیر نہ صرف قرآن کی تفسیر کے قائل ہیں، بلکہ انہوں نے بڑے دھڑلے سے اس جسارت کا اظہار کیا ہے کہ "اسباب نزول سے متعلقہ صحیح احادیث 'نظم قرآن' کو سب سے زیادہ درہم برہم کرنے والی ہیں۔" نعوذ بالله من هذه الجسارة الجريمة الكبيرة!

﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ...﴾ کی تفسیر میں حدیث سے گریز

اس آیت کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

"اور ان کی موت سے پہلے تمام اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہی دیں گے۔"

اس آیت میں دو ضمیریں ہیں: ایک لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ میں اور دوسری قَبْلَ مَوْتِهٖ میں، ان دونوں ضمیروں کے مراجع کون ہیں، یعنی یہ ضمیریں کس کی طرف لوٹ رہی ہیں یا بالفاظِ دیگر ان کا مصداق کون ہے؟ یا کون کون ہیں؟

ان ضمیروں کے مصداق میں اختلاف کی وجہ سے اس کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

پہلی رائے: پہلی یہ ہے کہ دونوں ضمیروں کا مرجع (مصداق) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کی تفسیر ہو گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے تمام یہودی اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے، یعنی مسلمان ہو جائیں گے۔ یہودی، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول نہیں مانتے، بلکہ نعوذ باللہ ان کو صحیح النسب تک تسلیم نہیں کرتے اور عیسائی انہیں 'اللہ' یا 'ابن اللہ' قرار دیتے ہیں، دونوں فرقے افراط و تفریط سے تائب ہو کر ان کو اللہ کا رسول تسلیم کر لیں گے۔ یا اسلام کا ایسا غلبہ ہو جائے گا کہ کوئی یہودی یہودی رہے گا، نہ عیسائی عیسائی رہے گا بلکہ یہ سب یا تو مسلمان ہو جائیں گے یا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہو گا جس کی پیش گوئی احادیث میں فرمائی گئی ہے۔

اس آیت کی یہ تفسیر سب سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کی وضاحت احادیثِ صحیحہ میں موجود ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرَ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ وَيَفِيضَ الْمَالُ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ حَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَاقْرَءُوا إِنْ شِئْتُمْ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا»[1]

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ عنقریب ابن مریم تمہارے درمیان نازل ہوں گے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے والے ہوں گے صلیب توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو قتل کر ڈالیں گے جزیہ ختم کر دیں گے (کیونکہ اس وقت سب مسلمان ہوں گے) اور مال کی اتنی بہتات ہو جائے گی حتیٰ کہ کوئی اس کا لینے والا نہ ملے گا۔ اس وقت ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھا جائے گا۔ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اگر اس کی تائید میں تم چاہو تو یہ آیت پڑھو ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ کہ کوئی اہل کتاب ایسا نہیں ہو گا جو عیسیٰ کی وفات سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن عیسیٰ ان پر گواہ ہوں گے۔"

اس حدیث میں حاکم (حَكَم) سے مراد شریعتِ اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کرنے والے ہیں کیونکہ حضرت

---

1 صحيح البخاري :كِتَابُ أَحَادِيثِ الأَنْبِيَاءِ ،بَابُ نُزُولِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ، حدیث:٣٤٤٨

عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بہ حیثیت نبی کے نہیں ہو گا بلکہ نبی کریم ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے ہو گا اور آپ کے ذریعے سے قیامت کے قریب شریعتِ محمدیہ کا نفاذ اور اسلام کا غلبہ ہو گا کہ تمام ادیان ختم ہو جائیں گے اور صرف اسلام کا بول بالا ہو گا۔

یہ احادیث اتنی کثرت سے آئی ہیں (صحیحین میں بھی ہیں) کہ اُنہیں تواتر کا درجہ حاصل ہے اور انہی متواتر صحیح روایات کی بنیاد پر اہل سنت کے تمام مکاتبِ فکر کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دنیا میں ان کا نزول ہو گا اور دجال کا اور تمام ادیان کا خاتمہ فرما کر اسلام کو غالب فرمائیں گے۔ ان احادیث میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ یاجوج وماجوج کا خروج بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کی موجودگی میں ہو گا اور انہی کی دعا کی برکت ہی سے اس فتنے کا بھی خاتمہ ہو گا۔

ان احادیث سے یہ بھی واضح ہے کہ نزولِ دنیا کے بعد ہی آپ کو موت آئے گی جب کہ یہودی اور عیسائی بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے یعنی مسلمان ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت وہی عقیدہ اپنالیں گے جو مسلمانوں کا ہے۔ اس لحاظ سے آیت ﴿ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴾ کی زیادہ صحیح تفسیر یہی ہے کہ دونوں ضمیروں کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں یعنی

لیؤمنن بعیسیٰ قبل موت[1]

امام ابن جریر طبری اور امام ابن کثیر نے بھی اسی کو اولیٰ الاقوال (سب سے بہتر رائے) قرار دیا ہے۔

دوسری آرا: دوسری آرا میں سے ایک رائے یہ ہے کہ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مَوْتِهٖ میں ضمیر کا مرجع اَحَد (محذوف) مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ہے۔ اس کا مطلب ہو گا کہ اہل کتاب میں سے ہر ایک اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے گو اس وقت ان کا ایمان لانا ان کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ کیونکہ آثارِ موت دیکھ لینے کے بعد ایمان لانا غیر مقبول ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور مَوْتِهٖ میں ضمیر کا مرجع كِتَابِي ہے۔ مطلب ہو گا کہ ہر یہودی اور نصرانی اپنی موت سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتا ہے۔ گو یہ ایمان بھی غیر نافع ہے۔

اصلاحی صاحب نے ان تینوں رایوں سے الگ ایک چوتھی رائے یہ اختیار کی ہے کہ پہلی ضمیر کا مرجع قرآنِ مجید ہے اور دوسری ضمیر کا مرجع آنحضرت ﷺ ہیں۔ اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آج تو یہ یہودی اور عیسائی

---

1 فتح الباری از حافظ ابن حجر: ۶/۶۰۱

قرآنِ مجید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی صداقت کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ قرآن اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔(خلاصہ)[1]

اس رائے کو موصوف نے سلف میں سے حضرت عکرمہ کی رائے قرار دیا ہے جب کہ ان کی رائے اس سے مختلف ہے اور وہ پہلی ضمیر کا مرجع قرآن کریم کو نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اور دوسری ضمیر کا مرجع 'کتابی' کو قرار دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے اسے تیسری رائے کے طور پر نقل کیا ہے۔[2] گویا اصلاحی صاحب کی رائے کا سلف میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔

بہر حال اس تفصیل سے ہمارا اصل مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ زیر بحث آیت جس سیاق میں ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل کتاب (یہود) کے اس موقف کی نفی فرما رہا ہے کہ اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا کر قتل کر دیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو ناکام فرما کر آسمان پر اٹھا لیا۔(اور حدیث میں اس کی مزید وضاحت یہ آئی ہے کہ) ایک وقت آئے گا کہ وہ قیامت کے قریب آسمان سے دنیا میں آئیں گے (گویا وہ اب تک زندہ ہیں، ان کو موت نہیں آئی) آکر دجال کو قتل کریں گے، اسلام کو غالب کریں گے اور جب ان کو موت آئے گی تو اس سے پہلے پہلے اہل کتاب ان پر ایمان لا چکے ہوں گے۔ گویا قرآن کا یہ سیاق، یعنی نظم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی نفی اور دوبارہ نزول کے بعد موت کا اثبات کر رہا ہے۔

اور اصلاحی صاحب 'نظم قرآن' کی تمام تر دہائی کے باوجود 'نظم' کے خلاف اُن کی موت کا موقف اختیار کر کے 'نظم قرآن' کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔

قرآن کریم کی 'نظم کشائی' کا کیا خوب مظاہرہ ہے؟ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ

۲۔ حدیث کی حجیت واہمیت کا اقرار بھی اور اس کا انکار بھی

حدیث کے بارے میں بھی اصلاحی صاحب کا رویہ سخت تضاد پر مبنی ہے جس کی وجہ سے لوگ اُنہیں حامیٔ حدیث ہی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے افکار کی پٹاری میں دونوں قسم کی چیزیں ہیں، حمایت والی بھی اور حدیث سے بغض وعناد والی بھی۔ بہت سے لوگ، جو اُن کے صرف ایک ہی پہلو پر نظر رکھتے ہیں، یا ان کی عقیدت مندی دوسرے پہلو کو دیکھنے ہی میں مانع ہے، یا جنہوں نے صرف ان کی گمراہی سے پہلے کی کتابیں اور تحریریں پڑھی ہیں، ایسے تمام لوگ ان کے گمراہانہ افکار کو سمجھنے ہی سے قاصر ہیں یا ان سے ناآشنائے محض ہیں۔

---

۱ تفسیر 'تدبر قرآن': ۲/۱۹۵، طبع اول

۲ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر... زیر بحث آیت

گزشتہ تفصیلات اور مباحث سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ موصوف احادیث کے انکار میں نہایت بے باک ہیں حتی کہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت مسلماتِ اسلامیہ کے بھی وہ منکر ہیں جس کا تصور ایک حامی حدیث سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پہلو تو الحمدللہ ہماری وضاحتوں اور حوالوں سے واضح ہے جس کا انکار آفتاب نصف النہار کے جھٹلانے کے مترادف ہے۔

دوسرا رخ، حدیث کی حجیت کا اعتراف

اس لیے اب ہم ان کا دوسرا چہرہ پیش کریں گے جس کی وجہ سے لوگ ان کو 'حامیٔ حدیث' ہی سمجھتے ہیں۔ حدیث کی حجیت واہمیت کی بابت ان کی صراحتیں ملاحظہ ہوں:

سورۃ بقرہ کی آیت:۱۲۹ میں دعائے ابراہیمی ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ کی تفسیر میں اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

"اب آیئے تعلیم کتاب وحکمت کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعلیم تلاوت سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ تلاوتِ آیات تو یہ ہوئی کہ رسول نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ خدا نے اس کے اوپر یہ وحی نازل کی ہے۔ تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت وتوجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لیے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے، اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے، اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کیے جائیں اور اس توضیح وبیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔ مزید برآں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے... یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزا میں سے ہیں... اور آپ نے اپنے صحابہ کے لیے تعلیم کتاب کے یہ تمام طریقے اختیار فرمائے۔

تعلیم کے ساتھ یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک کتاب کا، دوسری حکمت کا۔ کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے... حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت، تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن کریم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو، اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں

بڑا وزن ہے۔"[1]

دیکھ لیجئے الفاظ کی حد تک یہاں اس بات کا اعتراف ہے کہ حکمت سے، حدیث مراد لینے میں بڑا وزن ہے علاوہ ازیں اس سے پہلے تعلیم کتاب کی جو تشریح موصوف نے کی ہے، وہ کیا ہے؟ کیا اسی کا نام حدیث نہیں ہے؟ اور وہ تشریح کہاں ہے؟ کیا یہ تشریح وہی نہیں ہے جو احادیثِ صحیحہ کے مستند مجموعوں میں محفوظ ہے؟ اور یہ تشریحاتِ نبوی کیا متواتر ہیں؟ نہیں۔ بلکہ اصطلاحی طور پر آحاد ہی ہیں۔ پھر اخبارِ آحاد، یعنی احادیثِ آحاد حجت کیوں نہیں؟

اگر احادیثِ آحاد حجت نہیں، تو تعلیم کتاب کی تشریح میں اصلاحی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ کہاں ہیں؟ اُمت آج ان سے استفادہ کرنا چاہے تو کس طرح استفادہ کرے۔ قرآن تو محفوظ ہے لیکن یہ تشریحات نبوی اگر غیر محفوظ ہیں تو نبی اکرم ﷺ کی تعلیم کتاب کی ساری کاوشیں تو (نعوذ باللہ) بے کار گئیں۔ کیونکہ ان کا مستند ریکارڈ ہی محفوظ نہیں۔

اگرچہ اُمّت مسلمہ کے نزدیک تو الحمدللہ قرآن کریم ہی کی طرح تشریحاتِ نبوی کا مستند ریکارڈ بھی محفوظ ہے لیکن بات تو اصلاحی صاحب اور ان جیسے مُشکّکین حدیث کی ہے جو حدیث کے مستند مجموعوں کو بھی نہ محفوظ سمجھتے ہیں اور نہ قرآن کی تفسیر و توضیح میں ان کو اہمیت دیتے ہیں۔ حدیث سے ان کی 'محبت' صرف زبان کی حد تک ہے، عملاً وہ حدیث دشمنی میں کسی بھی بڑے سے بڑے منکر حدیث سے کم نہیں۔

حدیث کی حجیت و اہمیت پر ان کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

سورۃ بقرہ کی آیتِ مذکورہ جس میں تعلیم کتاب و حکمت کو نبی کریم ﷺ کے فرائض نبوت بتلایا گیا ہے، انہی الفاظ میں وہ آیت سورۃ الجمعہ میں بھی آئی ہے۔ اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

"یہاں نبی کریم ﷺ کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں، ان پر سورۃ بقرہ کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ آپ کی بعثت کے مقاصد کے متعلق جو غلط فہمیاں منکرین حدیث نے پھیلائی ہیں وہ دور ہو جائیں۔"[2]

مزید ملاحظہ فرمائیں۔ اسی سورۃ الجمعہ کی تفسیر میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اگرچہ آیات کے تحت ان سے مستنبط ہونے والی باتوں کی طرف ہم توجہ دلاتے آرہے ہیں لیکن چند

---

۱ تفسیر تدبر قرآن: ۱/ص: ۱۲، ۱۳ بحوالہ ماہنامہ میثاق: جولائی و اگست ۱۹۶۶ء

۲ تفسیر تدبر قرآن: ۸/ ۳۷۸، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۴ء

باتیں مزید توجہ کی مستحق ہیں:

ایک یہ کہ جمعہ کی نماز، اس کی اذان اور اس کے خطبہ سے متعلق یہاں مسلمانوں کو ہدایات دی گئی ہیں اور ان کی ایک غلطی پر جس طرح تنبیہ فرمائی گئی ہے، اس کا انداز شاہد ہے کہ جمعہ کے قیام سے متعلق ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام پائی ہیں حالانکہ قرآن میں کہیں بھی جمعہ کا کوئی ذکر نہ اس سے پہلے آیا نہ اس کے بعد ہے بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ اس کے قیام کا اہتمام ہجرت کے بعد مدینہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا اور لوگوں کو آپ ہی نے اس کے احکام و آداب کی تعلیم دی۔ پھر جب لوگوں سے اس کے آداب ملحوظ رکھنے میں کچھ کوتاہی ہوئی تو اس پر قرآن نے اس طرح گرفت فرمائی گویا براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے احکام و آداب کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ رسول کی طرف ان کی نسبت کی تحقیق تو ضروری ہے لیکن نسبت ثابت ہے تو ان کا انکار خود اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار ہے۔"[1]

قرآن کی طرح حدیث کے ماخذِ شرعی ہونے کا کیسا واشگاف اعلان واظہار ہے۔ لیکن حیاتِ عیسیٰ کی بابت مسلّمہ احادیث کا انکار بھی ملاحظہ فرمائیں جس کا مکمل اقتباس پہلے گزرا۔ لیکن ان کا تضاد دیکھیے کہ "رسول کے دیے ہوئے احکام بعینہٖ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو۔"

دوسری طرف فرمانِ اصلاحی ہے:

"قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ مسیحؑ دوبارہ آئیں گے، اتنا بڑا عقیدہ قرآن میں ہونا چاہیے تھا، اخبار آحاد پر ہم کوئی عقیدہ قائم نہیں کر سکتے۔"[2]

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام اور دوبارہ نزول کی احادیث ۸۵ صحابہ سے مروی ہیں، پھر بھی وہ آحاد ہیں۔ چہ خوب؟

دوسرے احادیث کی یہ تقسیم آحاد اور متواتر؟ یہ قرآنِ کریم کی کس آیت سے ثابت ہے؟ چلیں، اس کو بھی چھوڑیے، صحابہ کرامؓ اور تابعین کے دور کے جو خیر القرون ہیں، کسی بھی ایک صحابی، تابعی، تبع تابعی کا قول دکھلا دیں جس نے یہ تقسیم کی ہو۔

تیسرے، یہ قرآن کی کس آیت سے ثابت ہے کہ احادیثِ آحاد سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

چوتھے، جمعہ کے احکام و آداب، جو قرآن میں نہیں ہیں، رسول نے دیے ہیں، آپ کے نزدیک وہ واجب

---

۱ تفسیر تدبر قرآن: ۸/ ۳۸۸

۲ شرح صحیح بخاری از مولانا اصلاحی: ۱/ ۵۰۹

التسلیم ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں وہ کیوں واجب التسلیم ہیں؟ کیا وہ اخبارِ آحاد نہیں ہیں؟

رجم کی حد کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ ہاں احادیث میں ہے جو تین درجن سے زیادہ صحابہؓ سے مروی ہیں۔ اللہ کے رسول کا یہ حکم اور اس پر عمل بھی، فراہی گروہ کو کیوں قبول نہیں ہے جب کہ بقول اصلاحی صاحب

"رسول کے حکم کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو، وہ بعینہٖ اللہ کا حکم ہے اور اس کا انکار اللہ کے احکام کے انکار ہے۔"

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو، یہ اقتباس حالتِ خوف ختم ہو جانے کے بعد اقامتِ صلاۃ کے حکم الٰہی کے ضمن میں ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"اس آیت (سورۃ النساء:۱۰۳) سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اوقات کی پابندی اقامتِ صلوٰۃ کی شرائط میں سے ہے۔ دوسری یہ بات نکلتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل ایمان پر جو کچھ فرض کیا ہے، وہ عین اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ فریضہ ہے درآنحالیکہ اوقاتِ نماز تمام تر نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ ہیں، قرآن میں ان کی کوئی صراحت نہیں ہے۔"[1]

اصلاحی صاحب کے حلقۂ تلمذ سے سوال ہے کہ رجم بھی نبی کریم ﷺ کی مقرر کردہ سزا ہے، اس کا انکار کیوں؟ اگر اس کا انکار اس بنا پر ہے کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ تو پھر اوقاتِ نماز، قرآن میں ان کی صراحت نہ ہونے کے باوجود، کیوں تسلیم ہیں؟

عقیدہ حیات مسیح کا انکار کیوں؟ کیا یہ احادیث سے ثابت نہیں ہے؟

اگر کہا جائے کہ نزول مسیح کی روایات 'آحاد' ہیں اس لیے قابل قبول نہیں تو اوقاتِ نماز کی احادیث کیا آحاد نہیں ہیں؟

۳۔ صحابہ کا اجماع حجت ہے!

۱۹۵۶ء میں 'سنتِ خلفاے راشدین' کے عنوان سے ماہنامہ 'ترجمان القرآن' لاہور (فروری) میں اصلاحی صاحب کا ایک مفصل مضمون، آٹھ صفحات پر مشتمل شائع ہوا تھا۔ یہاں ان کے تضاد کو واضح کرنے کے لیے اس کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اب میں یہ بتاؤں گا کہ میں خلفائے راشدین کے اس طرح طے کردہ مسائل کو کیوں سنت کا درجہ دیتا

---

۱ تفسیر تدبر قرآن: ۲/ ۱۴۵، طبع اول

ہوں۔ میرے نزدیک اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کی پہلی وجہ تو وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے خود خلفائے راشدین کی سنت کو سنت کا درجہ بخشا ہے اور اسی حیثیت سے اس پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اجماع ہمارے ہاں ایک شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اجماع کی سب سے اعلیٰ قسم اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہی ہو سکتی ہے جس کی مثالیں خلفاء راشدین کے عہد میں ملتی ہیں۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابتدا سے خلفائے راشدین کے تعامل کو ملت میں ایک مستقل شرعی حجت کی حیثیت دی گئی ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دین کی تکمیل اگرچہ حضور نبی کریم ﷺ کے ذریعے سے ہوئی ہے لیکن امت کی اجتماعی زندگی میں اس کے مضمرات کا پورا مظاہرہ حضرات خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوا....''[1]

تفسیر میں بھی اجماع کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اسے رفع اختلاف کے لیے ایک منصوص طریقہ قرار دیا اور کہا ہے کہ اس کی مخالفت کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔[2]

ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا حد رجم پر صحابہ کا اجماع ہے یا نہیں؟ نزولِ مسیح پر اجماع ہے یا نہیں؟ معراج کے جسمانی ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے یا نہیں؟ اور اب ان اجماعی مسائل سے انحراف یا ان کا انکار اصلاحی صاحب کا تضاد ہے یا نہیں؟ اصلاحی صاحب کا حلقۂ ارادت و تلمذ جواب دے!!

۴۔ ائمہ اربعہ کا اتفاق بھی دین میں حجت ہے!

اصلاحی صاحب اپنے دورِ اوّل میں اس بات کے بھی قائل رہے ہیں کہ جس مسئلے میں ائمہ اربعہ بھی متفق ہوں تو ان کا یہ اتفاق بھی اجماعِ امّت کے مترادف اور دین میں حجت ہے۔ موصوف کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک انطباق تو وہ ہے جس پر خلفائے راشدین اپنے دور کے اہل علم و تقویٰ کے مشورے کے بعد متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام میں اجماع کی بہترین قسم ہے اور یہ بجائے خود ایک شرعی حجت ہے۔ اسی طرح ایک انطباق وہ ہے جس پر ائمہ اربعہ متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اگرچہ درجے میں پہلی قسم کے اجماع کے برابر نہیں ہے تاہم چونکہ یہ امت من حیث الامت ان ائمہ پر متفق ہو گئی ہے.... اس وجہ سے

---

۱ ملخصاً... ماہنامہ 'ترجمان القرآن' لاہور، فروری ۱۹۵۶ء، ص: ۳۸۔۳۹

۲ تفسیر تدبر قرآن: ۲/ ۹۷

ان ائمہ کے کسی اجماع کو محض اس دلیل کی بنا پر ردّ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ معصوم نہیں تھے۔ یہ معصوم تو بے شک نہیں تھے لیکن ان کے معصوم نہ ہونے کے معنی ہر گز یہ نہیں ہیں کہ کسی امر پر ان کا اتفاق بھی دین حجت نہ بن سکے۔"[1]

اب اصلاحی صاحب کے ارادت مند ہی واضح فرمادیں کہ حدِ رجم پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے یا نہیں؟ اگر اتفاق ہے تو حدر جم (شادی شدہ زانی کے لیے) حد شرعی ہے یا نہیں؟

عقیدہ نزولِ مسیح پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس پر ان کا اتفاق دین میں حجت ہے یا نہیں؟

معراج کے جسمانی ہونے پر ان ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر اس کا انکار کیوں؟

۵۔ کتاب وسنت کی تعبیر میں سلف صالحین کی پیروی

یہ عنوان اصلاحی صاحب ہی کا مقرر کردہ ہے جب وہ صالح الفکر اور زیغ وضلال سے محفوظ تھے، اس عنوان کے تحت 'تجدد پسندوں' کو اُنہوں نے تنبیہ فرمائی ہے کہ وہ 'شوقِ اجتہاد' میں اسلاف کی تعبیر سے اختلاف نہ کریں، اگر اُنہوں نے نئی تعبیریں کیں تو لوگ ہر گز قبول نہ کریں گے۔ ان کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

"تدوین قانون کے کام کے ہر مرحلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے کہ مسلمان کتاب وسنت کی جن تعبیروں پر اعتماد رکھتے ہیں، انہی تعبیروں پر مبنی ضابطۂ قانون بنایا جائے۔ اگر اپنی طرف سے نئی تعبیریں محض شوقِ اجتہاد میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تو ان کو لوگ ہر گز قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ (آگے چل کر مزید دیکھتے ہیں) سلامتی کا راستہ ہمارے نزدیک یہی ہے کہ کتاب وسنت کی تعبیرات میں سلف صالحین کی پیروی کی جائے۔"[2]

اصلاحی صاحب کا یہ اقتباس، ان کی تفسیری کاوشوں پر، جس میں انہوں نے جابجا سلف صالحین کی تعبیرات سے شدید اختلاف وانحراف کیا ہے، خطِ تنسیخ پھیر دیتا ہے۔

ان کی تفسیر کتاب وسنت کی تعبیرات میں سلف صالحین کے منہج سے سراسر ہٹی ہوئی ہے، بنابریں وہ ہر گز قابل قبول نہیں۔ پتہ نہیں اتنا بڑا تضاد اب بھی 'تدبر' کے گن گانے والوں کو نظر آئے گا یا نہیں؟ کیونکہ حضرت ابو درداءؓ کا قول ہے: حبّك الشيء يعمي ويصم[3]

---

۱ 'عائلی کمیشن کی رپورٹ' ص: ۵۸، طبع فیصل آباد

۲ 'اسلامی قانون کی تدوین' از مولانا اصلاحی: ص ۱۳۵ تا ۱۳۷

۳ سنن ابوداؤد: ۵۱۳۰

"تیرا کسی چیز سے محبت کرنا، اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔"

۶۔ روایت بالمعنی کے بارے میں سخت متضاد رویہ

راویانِ حدیث (صحابہ کرامؓ سے لے کر جامعین حدیث تک) سب نہایت ثقہ، قوی الحافظہ اور عادل وضابط تھے، اس لیے محدثین نے ان کی بیان کردہ روایات کو صحیح قرار دے کر کتابوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ کسی محدث نے بھی روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ کی بحث نہیں چھیڑی، کیونکہ یہ قطعاً غیر ضروری تھی۔ لیکن جب سے احادیث کو کنڈم کرنے کا رجحان پیدا ہوا، اس وقت سے ردِّ حدیث کے دیگر طریقوں کے ساتھ روایت بالمعنی کا حربہ بھی منکرین حدیث نے اختیار کیا۔

اصلاحی صاحب نے بھی یہ حربہ اختیار کیا ہے لیکن اس معاملے میں بھی انہوں نے عجیب متضاد رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ روایت بالمعنی کا ہوا کھڑا کر کے راویانِ حدیث کی ثقاہت کو بھی مجروح کرتے ہیں اور ساتھ ہی روایت بالمعنی کی ناگزیریت کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اس کے بغیر احادیث کا بہت سا حصہ ہم تک نہ پہنچ پاتا۔ نیز یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ

> "یہ سب راوی میری نظر میں ثقہ اور بڑے لوگوں سے ہیں۔ اگر انکے ہاں الفاظ میں کچھ اختلاف بھی ہوتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ وہ سب ایسے لوگ ہیں کہ اگر روایت بالمعنی بھی کریں تب بھی حقیقت نہیں بدلتی کیونکہ وہ دین کو سمجھنے والے لوگ ہیں، عام لوگ نہیں۔"[1]

اگرچہ یہ اقتباس درود کے مختلف الفاظ روایت کرنے والے مختلف راویوں کے بارے میں ہیں۔ لیکن ان کے الفاظ تمام راویانِ حدیث کے بارے میں ہیں۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں ان کے دیگر اقتباسات بھی اس سے پہلے ہم نقل کر آئے ہیں جہاں روایت بالمعنی کی اہمیت وضرورت کا اعتراف کیا ہے۔ قارئین کرام یہ تفصیلی بحث اصلاحی صاحب کی شرح صحیح بخاری پر ہمارے تفصیلی نقد میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

۷۔ محدثین کی خدمات کا اعتراف بھی اور انکار بھی

محدثین کرام نے حدیث کی حفاظت، جمع وتدوین اور ان کی تحقیق وتنقیح کا جو بے مثال اور عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس کی بابت اصلاحی صاحب کا مفصل اقتباس ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جس میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ "ان اکابرین فن نے تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھوا ہے اور انسانی امکان کی حد تک

---

۱ رسالہ تدبر، لاہور: شمارہ ۸، ستمبر ۲۰۰۳ء: ص ۵۱

اس فن کی خدمت کی ہے۔''[1]

لیکن دوسری طرف 'مبادئ تدبر حدیث' جیسی فضول کتاب لکھ کر محدثین کی ساری کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے اور کہا ہے کہ ابھی حدیث کی تحقیق میں کئی خلا باقی ہیں۔ گویا جب تک یہ خلا پر نہیں ہوں گے، محدثین کی ساری محنتیں بھی برباد ہیں اور احادیث کے سارے مجموعے بھی ناقابل اعتبار وناقابل اعتماد ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کتنا بڑا تضاد ہے موصوف کے رویے اور اقوال میں!!

۸۔ حدیثِ واحد کا اقرار بھی، انکار بھی!

اصلاحی صاحب کے انکارِ حدیث کی مذکورہ صورتیں جو قارئین کرام نے گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں، ان سب کی بنیاد ان کا یہ فرمان تھا کہ ''یہ 'آحاد' ہیں اس لیے یہ ظنی، یعنی مشکوک ہیں۔'' اس پر اطمینان اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا (اس پر ہم الحمدللہ علیحدہ تفصیل سے بحث کر چکے ہیں) لیکن اب تصویر کا دوسرا رخ، یعنی اخبار آحاد کی اہمیت بھی ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''ہمارے نزدیک اسلام نے زندگی کے معاملات چلانے کے لیے ہمیں اخبارِ متواتر کے ساتھ نہیں باندھا ہے، زندگی کے اکثر معاملات اخبارِ آحاد ہی سے چلتے ہیں۔ لہٰذا فطرت اور شریعت کا مطالبہ ہم سے یہ نہیں ہے کہ جب تک کسی امر میں ہمیں پورا یقین نہ ہو جائے، اس وقت تک ہم اس کو باور ہی نہ کریں۔ اگر ایسا ہوتا تو زندگی محال ہو جاتی۔ زندگی بسر کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ ظن غالب پر اعتماد کیا جائے۔ عام دنیوی معاملات میں تو کافر و مؤمن کے امتیاز کے بغیر ہر ایک کی بات ماننی پڑتی ہے، اِلا آنکہ کسی بات کے جھوٹا ہونے کا کوئی واضح قرینہ موجود ہو۔ اس معاملے میں عام مروّجہ ذرائع معلومات پر ہی اعتماد کرنا ہوگا۔ اس امر کی تحقیق میں نہیں پڑیں گے کہ اس خبر کا راوی کس درجے کا ہے۔

رہے دینی معاملات تو ان میں ہدایت یہ ہے کہ اگر کوئی فاسق کوئی اہم خبر دے تو اس کی تحقیق کی جائے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ.. ﴾[2]

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید نے خبر واحد کے ردّ و قبول میں خبر دینے والے کی شخصیت،

---

۱ مبادی تدبر حدیث از مولانا اصلاحی: ص۸۹ تا ۹۱

۲ سورۃ الحجرات: ۶

روایت کی نوعیت، قرائن اور خصوصیات ہی پر اعتماد کا حکم دیا ہے۔ اگر خبر دینے والا فاسق نہیں ہے تو تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ وہ خبر اہم ہی ہے۔ لیکن اگر وہ فاسق ہے تو روزمرہ کے عادی امور میں تو تحقیق کی ضرورت نہیں ہو گی، البتہ اہم معاملات میں تحقیق کی جائے گی۔ اس شکل میں خبر دینے والے اور خبر دونوں کے متعلق تحقیق ہو گی۔.... علیٰ ہذا القیاس خبر کی نوعیت پر بھی غور ہو گا اور اس کے قرائن اور خصوصیات کا بھی جائزہ لیا جائے گا، اگر یہ تمام چیزیں اس کی تائید میں ہوں گی تو اس کی بات باور کی جائے گی ورنہ ردّ کر دی جائے گی۔"

اس کے بعد 'خلاصۂ بحث' کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

"خلاصۂ بحث: اخبارِ آحاد پیغمبر کے علم کے منتقل ہونے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہر خبر واحد حجت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ اخبار آحاد محض آحاد ہونے کی بنا پر ناقابل اعتبار نہیں قرار دی جائیں گی بلکہ ان پر اعتماد کیا جائے گا....."[1]

اخبار آحاد کے بارے میں اصلاحی صاحب کا یہ اقتباس ان کے انکار حدیث کے تمام حربوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے، کاش وہ اپنے اتنے بڑے فکری تضاد کو محسوس کرتے اور انکارِ حدیث کے فتنے کو برگ وبار مہیا نہ کرتے۔

ع کاش کہ بہ صد جا نوشتہ ایم

۹۔ تورات کے بارے میں قول و عمل کا تضاد

تورات کے بارے میں یہ بات مسلّمہ ہے کہ اس میں اتنی تحریفات ہو چکی ہیں کہ اس کے کسی بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ خود اصلاحی صاحب کو بھی اس مسلّمہ حقیقت کا انکار نہیں بلکہ اعتراف ہے۔ چنانچہ تورات کے محرف اور ناقابل اعتبار ہونے کے متعلق موصوف کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تورات کئی مرتبہ غائب ہوئی ہے اور کئی مرتبہ زبانی روایات کے ذریعے سے مرتّب ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اس کے نسخوں میں اختلاف بھی ہوا اور اس کے اندر برابر کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے۔"[2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

---

۱ مبادئ تدبر حدیث، ص: ۱۲۳ تا ۱۲۵

۲ تفسیر تدبر قرآن: ۴/ ۱۲۲، طبع ۱۹۷۶ء

"تورات کے متعلق یہ بات یاد رکھئے کہ اس میں صرف تحریف ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ متناقض روایات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ اس میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا باطل و محرف۔ تورات کے اس طرح مسخ ہو جانے کے سبب سے یہود خدا کی دی ہوئی روشنی سے محروم ہو کر بالکل تاریکی میں گھر گئے تھے۔"[1]

ایک اور مقام ملاحظہ فرمائیں:

"یہ واقعہ ہے کہ تورات کے مختلف حصوں میں ایک ہی بات اتنے متضاد طریقوں سے بیان ہوئی ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہماری اس کتاب میں تورات کے تضادات کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں... تورات میں اس طرح کے تضادات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہم پیچھے اشارات کر چکے ہیں کہ حفاظت کا وہ اہتمام اس کو حاصل نہ ہو سکا جو قرآن کو حاصل ہوا۔ اس پر متعدد بار ایسی آفتیں آئیں کہ پوری تورات ناپید ہو گئی۔ بعد میں جن بزرگوں نے اس کو مرتب کیا محض اپنی یاد داشت سے محفوظ کیا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے مرتب کرنے والے لوگ کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ اس کے بعض صحیفے بالکل صیغۂ راز میں رکھے جاتے تھے جن کے مندرجات سے خاص محرمانِ راز کے سوا دوسرے لوگ واقف نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے کہ ان میں ایسی باتیں تھیں جن کی عام اشاعت علمائے یہود اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس طرح کی باتوں میں اُنہوں نے اپنے حسبِ منشا تحریفات بھی کیں اور وہ اس تحریف میں کامیاب ہو گئے۔ کسی ایسی کتاب میں تناقضات کا پیدا ہو جانا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے اور ان تناقضات کا بالکل بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو جائے۔ لوگ اسی تاریکی میں پھر گھر جائیں جن سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ روشنی نازل فرمائی تھی اور ان کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو جائیں جن کو دور کرنے کی کوئی سبیل باقی ہی نہ رہ جائے۔"[2]

اسی سلسلۂ بیان میں آگے چل کر اصلاحی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس اختلاف و تناقض کا جو تورات میں پیدا کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا

---

۱ تفسیر تدبر قرآن: ۴/ ۷۶۴

۲ تفسیر تدبر قرآن: ۷/ ۱۱۷، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۴ء

کہ تورات کی ہر چیز خود اہل تورات کی نگاہوں میں مشکوک ہوگئی جس سے حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا...۔"[1]

تورات کے بارے میں اصلاحی صاحب کی وضاحتوں کا خلاصہ

① تورات کئی مرتبہ ناپید ہوئی۔
② (کئی مرتبہ) یادداشتوں سے مرتب ہوئی۔
③ مرتب کرنے والے کون تھے اور کن اوصاف کے حامل تھے؟ نامعلوم ہیں۔
④ اس کے بہت سے حصے صیغۂ راز میں رکھے گئے۔
⑤ اس کے نسخوں میں بھی اختلافات ہیں۔
⑥ یہ تناقضات کا مجموعہ ہے۔
⑦ خود اہل تورات کے نزدیک بھی تورات مشکوک ہے۔
⑧ اس کی حفاظت کا اہتمام نہیں ہوا۔ (یعنی غیر محفوظ ہے)
⑨ یہ مسخ شدہ اور محرف ہے۔
⑩ اس میں یہ پہچاننا ناممکن ہے کہ اس میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا باطل ہے۔
⑪ مذکورہ باتوں کی وجہ سے حقیقت گم ہو گئی ہے۔
⑫ خدا کی دی ہوئی روشنی سے اب یہ محروم ہے۔
⑬ بلکہ اس میں تاریکی ہی تاریکی ہے۔

احادیث کے بارے میں اصلاحی موقف اور تورات کے بارے میں دوسرا موقف

اس کے مقابلے میں احادیث الحمدللہ محفوظ ہیں کیونکہ قرآن کی حفاظت کا وعدۂ الٰہی، احادیث کی حفاظت کو بھی مستلزم ہے۔ اللہ نے اپنی تکوینی مشیت کے تحت محدثین کرام کے ذریعے سے حدیث کی حفاظت فرمائی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ احادیث محفوظ نہ ہوتیں تو قرآن پر عمل کرنا ہی ناممکن تھا، یوں حفاظتِ قرآن کا اہتمام بے فائدہ ہوتا۔ علاوہ ازیں دین اسلام بھی مکمل کے بجائے نامکمل رہتا جبکہ اللہ نے دین اسلام کی تکمیل کا اعلان خود قرآن مجید میں کیا ہے۔

---

1 تفسیر تدبر قرآن: ۱۱۸/۷.